اسلام

اور

اجتماعیت

مولانا صدرالدین اصلاحیؒ

فہرست مضامین

اسلامی اجتماعیت ـــــــــــ ۶۳

اسلامی اجتماعیت کی ہیئت کاملہ ـــــــــــ ۷۵

مقدمہ

عمل کا زوال اگر زیادہ عرصے تک باقی رہ جائے تو وہ صرف عمل ہی کی زوال نہیں رہ جاتا۔ بلکہ پہلے جذبات و احساسات کا، اور پھر افکار و تصورات کا بھی زوال بن جاتا ہے۔ جب کوئی قوم یا ملت اپنی اصل حیثیت زندگی کے میدان میں کھو بیٹھتی ہے تو وہ اسے اپنے ذہن میں بھی زیادہ دنوں تک ٹھیک ٹھیک محفوظ نہیں رکھ سکتی، اور اس پر خود ناشناسی کی تاریکیاں چھا جاتی ہیں۔ وہ بھولنے لگتی ہے کہ اس زمین پر اس کا وجود کس غرض کے لئے ہے؟ اور اس کو پورا کرنے کے لئے اُسے کون سا طرزِ فکر اور طریق کار اپنانا چاہیئے؟

ملت اسلامیہ پر ایک مدت سے یہی نفسیاتی عمل طاری ہے۔ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے دین کو قائم کرنا، اور قائم رکھنا، ساری دنیا کے اوپر حق کا شاہد اور نگراں بننا، معروف کا حکم دینا اور منکر سے روکنا، اور خیر کامل کی طرف لوگوں کو بلاتے رہنا، اس کی منصبی ذمہ داری تھی۔ یہی اس کے وجود کی کل غایت تھی، اور یہی اس کی اصل حیثیت تھی۔ اس نے ایک وقت تک اس ذمہ داری کو اس طرح انجام دیا جس طرح انجام دینے کا حق تھا، اور صرف اسی نے نہیں، بلکہ دوسروں نے بھی سر کی آنکھوں سے دیکھ لیا

کہ اس ملت کی غایت وجود، اور اس کی اصل حیثیت یہ ہے۔ پھر اس کی غفلتوں نے
اس کی زندگی کی بساط اُلٹ دی، اور اسے اپنی اس حیثیت سے عملاً محروم کر کے رکھ دیا۔
اس محرومی نے فطری طور پر مزید محرومیوں کو جنم دینا شروع کر دیا، اور اب صورتِ حال یہ
ہے کہ اسے اپنا مقصد وجود، اپنے اصولِ حیات اور اپنے دینی تصورات، لفظوں کی
حد تک تو ضرور یاد رہ گئے ہیں، مگر یہ باور کرنا بہت مشکل ہے کہ ان کے معانی بھی صحیح
طور پر اسے یاد رہ گئے ہیں۔ اور اگر یہ بھی باور کر لیا جائے، تو کم از کم یہ تو کسی حال میں بھی نہیں
مانا جا سکتا کہ جذباتی اور فکری طور پر بھی اس کے اندر ان کی اہمیت کا احساس باقی رہ گیا ہے۔

انہی اصول حیات اور دینی تصورات میں سے ایک اہم ترین چیز اس کے اجتماعی
کردار اور اس کی اپنی مخصوص تنظیم کا مسئلہ بھی ہے۔ جو بظاہر ایک مسئلہ ہے، لیکن فی الواقع
متعدد مسائل کا جامع ہے، اور غلط نہ ہوگا اگر اسے ملتِ اسلامیہ کی شہ رگ سمجھا جائے۔
اتنے اہم مسئلے کی حقیقت سے، اس کی اہمیت سے، اور اس کے عملی مطالبات سے
عام دل و دماغ افسوس ناک حد تک بے گانہ ہو چکے ہیں۔ اس بیگانگی کا حال یہ ہے کہ
آج ملت کے چارہ سازوں کا ایک گروہ تو اس کے تصوّر ہی سے پریشان ہو اُٹھتا ہے،
اور دین کے اجتماعی کردار اور ملت کی تنظیم کو زمانے کا سب سے بڑا کفر سمجھتا ہے۔ اس
کے نزدیک لوگ ہر کام کے لئے اکٹھے ہو سکتے ہیں، ہر مقصد تنظیم کی بنیاد بن سکتا ہے، ہر مشن
اور "ازم" کی خاطر گروہ سازی کی جا سکتی ہے، لیکن مسلمان بحیثیت مسلمان، اور اسلام
کی خاطر ہرگز منظم نہیں ہو سکتے۔ دوسرے لوگ اگرچہ اس طرح نہیں سوچتے، اور وہ
مسلمانوں کے متحد ہو جانے کو اپنی محبوب ترین تمنا سمجھتے ہیں لیکن مسلمان متحد و منظم کس
لئے ہوں؟ کس طرح ہوں؟ کن بنیادوں پر ہوں؟ اور اگر نہ ہوں تو اس کا حقیقی نقصان

کیا ہے؟ یہ جاننے اور بتانے والے ان میں بھی بہت کم ملیں گے ــــ چنانچہ اس سلسلے میں کہنے والے جو کچھ کہتے سُنے جاتے ہیں، اس سے بسا اوقات "کلمۃ حق ارید بھا الباطل" کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ نام تو ملت اسلامیہ کی تنظیم کا لیا جاتا ہے، مگر اس کا مفہوم، اس کی غایت، اس کا طریقہ، سب کا سب عموماً وہ ہوتا ہے جو اسلامی سے زیادہ غیر اسلامی ہوتا ہے۔ مسلمان جس مرکز پر اور جس طرح بھی متحد ہو جائیں، وہ ان کے نزدیک 'اسلامی اتحاد' اور 'ملی تنظیم' ہے۔ حالانکہ اسلام نے مسلمانوں کو صرف اللہ کی کتاب پر، اور اس کے رسول کی سُنّت کے مطابق ہی منظم ہونے کی تلقین کر رکھی ہے۔ مسلمانوں کی ہر اجتماعی ہیئت ان کی نظر میں اسلام کی متاع مطلوب ہے، حالانکہ اس کو صرف 'جماعت' نہیں بلکہ "الجماعۃ" مطلوب ہے، اور "الجماعۃ" کا مفہوم، بقول علامہ رشید رضا مصری "زمانۂ نبوت میں مسلمانوں کی ایسی ہیئتِ اجتماعی سے تھا جو کتاب وسنّت کے احکام کو زیر عمل لاکر دین کو قائم رکھے" (تفسیر المنار جلد ۶، صہ ۳۶۷)

اس صورتِ حال کا شدید مطالبہ تھا کہ اس اہم ترین مسئلے کے تمام ضروری پہلو کتاب وسنّت کی روشنی میں بالکل واضح کر دیئے جائیں۔ تاکہ جب ملی اتحاد و تنظیم کی باتیں کی جائیں، اور کوششیں انجام دی جائیں، تو معاملے کی حقیقی نوعیت نگاہوں سے اوجھل نہ ہو، اور یہ اچھی طرح معلوم رہے کہ اسلام نے جس اجتماعیت اور تنظیم کا حکم دیا ہے وہ فی الواقع ہے کیا؟ وہ دین وملّت کو کس حد تک مطلوب ہے؟ اور کیوں مطلوب ہے؟۔

یہ کتاب دراصل اسی مطالبے کو پورا کرنے کی ایک کوشش ہے۔ خدا کرے کہ یہ کوشش کامیاب ہوئی ہو۔

صدر الدین

دوشنبہ ۲ر ذی الحجہ سنہ ۱۳۸۱ھ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اسلام میں اجتماعیت کا مقام

انسانی فطرت اور اجتماعیت

جس طرح بچے کے تصور کے ساتھ ماں کی گود کا تصور بھی آئے بغیر نہیں رہتا، اسی طرح انسانی زندگی کے ساتھ اجتماعیت کا تصور بھی لازمًا آتا ہے۔ کوئی زمانہ ایسا نہیں پایا جاتا جب انسان اجتماعیت سے یکسر بے نیاز رہا ہو، چنانچہ تاریخ کے دھندلے سے دھندلے گوشوں میں بھی اس کے آثار ناپید نہیں۔ جب "تمدن" کی داغ بیل بھی نہیں پڑی تھی۔ جب انسان غاروں کے باہر بھی نہیں آسکا تھا، جب اس نے غلے اُگانے اور کپڑے بنانے کی بات بھی نہ سوچی تھی، جب درختوں کے سایے اور پھل پتے ہی اس کے لئے مدارِ حیات تھے، اس وقت بھی وہ خاندانوں کی شکل میں مِل جُل کر رہتا تھا، اور اس اجتماعیت کو وہ اپنا گہوارۂ زندگی سمجھتا تھا۔ پھر جوں جوں اس کا ذوقِ تمدن اُبھرتا گیا اور وسیع تر اجتماعیت کی رکاوٹیں چھٹتی گئیں، اس کی اجتماعیت پسندی بڑھتی چلی آتی گئی۔ خاندانی اکائیاں قبائلی وحدتیں اور پھر قبائلی وحدتیں قومی اجتماعیت میں تبدیل ہوتی گئیں، اور اب یہ قومی اجتماعیتیں ایک عالمی اجتماعی ادارے، بلکہ ایک بین الانسانی کنبے میں تحلیل ہوجانے کے لئے تیار ہو رہی ہیں۔

انسان کا یہ طرزِ عمل مسلسل کیوں چلا آرہا ہے؟ وہ پہلے ہی دن سے اجتماعیت کا طالب کیوں ہے؟ اور رفتارِ زمانہ کے ساتھ ساتھ اس کی یہ طلب کیوں بڑھتی اور نکھرتی گئی ہے؟ ان

سوالوں کے جواب میں باتفاق رائے یہی کہا جائے گا کہ کچھ ایسے زبردست عوامل ضرور ہیں جو اُسے اپنے دوسرے ابنائے نوع سے بے تعلق نہیں رہنے دیتے، جو اُسے اندر ہی اندر مجبور کئے رکھتے ہیں کہ ان سے مل کر رہے، اور علیحدگی اور تنہائی کے بجائے ان کی معیت میں زندگی بسر کرے۔ اپنے اندر کی دنیا کا جائزہ لیجئے تو پائیں گے کہ یہ عوامل تعداد میں دو ہیں: ہم جنسی کی کشش اور تعاون کی احتیاج۔

"ہم جنسی کی کشش" سے مراد یہ ہے کہ انسان نفسیاتی طور پر اپنے ہم جنسوں سے ایک خاص اُنس رکھتا ہے، ان کے لئے اپنے اندر ایک گہری کشش پاتا ہے، ان کی معیت اور ہم نشینی میں ایک فرحت بخش سکون محسوس کرتا ہے، اور ان سے یکسر علیحدگی اُسے بے چین بنا دیتی اور مسلسل یا طویل تنہائی وحشت میں مبتلا کر دیتی ہے۔

"تعاون کی احتیاج" کا مطلب یہ ہے کہ ایک طرف تو اس کی ذاتی اور انفرادی قوتیں حد درجہ محدود ہیں، دوسری طرف اُن کے مقابلہ میں اُس کی دُنیوی ضرورتیں حد درجہ بڑی اور وسیع ہیں، اس لئے یہ قوتیں ان ضرورتوں کے معاملے میں ہرگز کافی نہیں ہو سکتیں اور وہ انھیں صرف اپنے ذاتی بل بوتے پر کسی طرح پورا نہیں کر لے سکتا، حتیٰ کہ جن ضرورتوں کو بالکل بنیادی اور ناگزیر ضرورتیں کہا جاتا ہے، ان کا پورا کر لینا بھی اس کے لئے اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ دوسرے بہت سے لوگ اس کی بلاواسطہ یا بالواسطہ مدد نہ کریں۔

اس طرح اجتماعیت انسان کی فطری طلب بھی ہے اور فطری ضرورت بھی۔ وہ دوسرے افرادِ انسانی کی طرف ہم جنسی کے پیدائشی جذبے کے تحت، بے اختیار کھنچتا بھی ہے، اور اپنی دنیوی ضرورتوں کے تحت ان کا محتاج بھی بنا رہتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس کی فطرت کی گہرائیوں میں اجتماعیت پسندی کی دو مضبوط جڑیں بالکل ساتھ ساتھ اُتری ہوئی ہیں۔ اس لئے اگر وہ اجتماعیت سے کبھی بے گانہ یا بے نیاز نہیں پایا گیا تو ایک قدرتی بات تھی، اور انسان جب

تک انسان ہے یہ بات اس کے لئے ہمیشہ قدرتی اور لازمی ہی رہے گی۔

یہ ایک ایسی مانی ہوئی حقیقت ہے جس کے بارے میں علم و دانش کے کسی دور میں بھی اختلاف نہیں پایا جاتا۔ دورِ قدیم کے مشہور یونانی عالم و فلسفی، ارسطو نے انسان کی تعریف میں یہ الفاظ لکھے ہیں :-

"انسان پیدائشی طور پر ایک سیاسی حیوان ہے" (ارسطو کی سیاسیات، ۱۲۵۳ - الف)

سیاست، ظاہر ہے کہ اجتماعیت ہی کی آخری شکل کا دوسرا نام ہے۔ اس لئے "سیاسی حیوان"، کے معنی ہوئے، وہ حیوان جو آخری اور انتہائی حد تک اجتماعیت پسند واقع ہوا ہو۔ گویا ارسطو کے نزدیک انسان کی وہ خاص صفت جو اسے حیوانات سے الگ اور ممتاز کرتی ہے، اس کی یہی آخری درجے کی اجتماعیت پسندی ہی ہے۔ اس کے اندر اگر یہ صفت نہ ہوتی تو وہ بھی منجملہ دوسرے حیوانوں کے فقط ایک حیوان ہوتا۔

وسطی دور کے معروف عالم اور محقق، علامہ ابنِ خلدون فرماتے ہیں کہ :-

"افرادِ انسانی کا اکٹھے مل کر رہنا سہنا ایک ناگزیر بات ہے، اور یہی وہ حقیقت ہے جسے اہلِ علم و دانش اس طرح بیان کرتے ہیں کہ انسان پیدائشی طور پر مدنیت پسند واقع ہوا ہے"۔ (مقدمہ ابن خلدون)

جہاں تک موجودہ دور کے علماء اور فلاسفہ کا تعلق ہے، اُن کے یہاں تو یہ بات ایسی مسلمہ حقیقتوں کی صف میں شامل ہو چکی ہے جو کسی بحث یا ثبوت کی بالکل محتاج نہیں ہوتیں۔

قرآنِ مجید علم النفس یا علم الاجتماع کی کتاب نہیں کہ اس میں انسان کے جذبۂ اجتماعیت کے متعلق کوئی راست گفتگو پائی جا سکے۔ لیکن اس کے باوجود اپنے دائرہ بحث میں وہ جو کچھ کہتا ہے اس کے پیچھے چونکہ دوسری بہت سی علمی حقیقتوں کی طرح انسانی نفسیات کے حقائق بھی ملحوظ رہتے ہیں، جیسا کہ ملحوظ رہنا چاہئے، اس لئے ضمناً ان حقائق کی طرف بھی اس نے واضح اشارے

گئے ہیں۔ ان اشارات کا جائزہ لیجئے تو صاف محسوس ہوگا کہ قرآن حکیم بھی انسانی فطرت کو اجتماعیت پسند ہی قرار دیتا ہے۔ مثلاً جب وہ یہ فرماتا ہے کہ نوعِ انسانی کی دونوں صنفوں میں ان کے خالق نے باہمی محبت اور رحم دلی پیدا کر رکھی ہے' (وَجَعَلَ بَیْنَکُمْ مَوَدَّۃً وَّرَحْمَۃً' سورۂ روم) تو گویا بالواسطہ وہ یہی کہتا ہے کہ انسان بنیادی طور پر اجتماعیت کا دلدادہ پیدا کیا گیا ہے۔ اسی طرح آخرت کی خوش کامیوں اور جنت کی نعمتوں کی تفصیل بیان کرتے وقت جب وہ اہل جنت کی ہم نشینی، ہم طعامی اور ہم کلامی کا بھی تذکرہ ضروری سمجھتا ہے[1] تو گویا اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ اجتماعیت انسانی فطرت کی ایسی عزیز طلب ہے جس سے وہ اس دنیوی زندگی میں کیا آخرت کی زندگی میں بھی اونچی نہیں ہو سکتی، اور وہاں بھی انسان کی تسکینِ خاطر اور تکمیلِ مسرت اسی وقت ہوگی جب کہ اسے اپنی جنس کے دوسرے افراد کی رفاقت اور مصاحبت میسر ہو۔

اسلام دینِ فطرت

انسانی فطرت کا یہ رُخ اپنے سامنے رکھئے۔ اس کے بعد اس امر کی تحقیق کیجئے کہ انسانی فطرت کے مطالبوں کو اسلام کیا حیثیت دیتا ہے؟ تاکہ قیاسی اور اصولی طور پر اس بات کا فیصلہ ہو سکے کہ اسلامی نظامِ فکر و عمل میں اجتماعیت اور اس کے عملی تقاضوں کو کوئی جگہ ملنی چاہیئے یا نہیں؟۔

انسانی خلقت کے بارے میں قرآن مجید کا فرمانا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے نفس

---

[1] مثلاً اِخْوَانًا عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِیْنَ' سورہ حجر (جنت والے بھائیوں کی طرح تختوں پر آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے) یَتَنَازَعُوْنَ فِیْھَا کَاْسًا .... وَاَقْبَلَ بَعْضُھُمْ عَلٰی بَعْضٍ یَّتَسَآءَلُوْنَ سورۂ طور (وہ جنت میں شراب بھرے پیالوں کی چھینا جھپٹی کریں گے.... اور ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر آپس میں باتیں کریں گے۔)

(قلب) کا "تسویہ" کیا ہے، (وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰاهَا، سورۂ شمس) "تسویہ" کے معنی، لغت میں، کسی چیز کو خوب درست کرنے کے ہوتے ہیں۔ دوسری جگہ اسی بات کو اس نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے کہ "ہم نے انسان کو "احسن تقویم" میں پیدا کیا ہے وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ، سورہ تین) "تقویم" کے معنی سیدھا کرنے کے ہوتے ہیں، اور جب کسی چیز کے باطن اور اس کی صفات کو بھی سامنے رکھ کر اس لفظ کا استعمال کیا گیا ہو تو اس وقت، قدرتی طور پر، اس کا مطلب اس چیز کو کسی خاص مقصد کے لئے موزوں و مناسب بنانا ہوتا ہے۔ اس لئے انسان کو "احسن تقویم" میں پیدا کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اسے ایسی ساخت عطا کی گئی ہے جو اس کے مقصد وجود کے لحاظ سے بہترین ساخت ہو سکتی تھی۔ ان وضاحتوں کے پیش نظر انسان کا "تسویہ" کرنے یا اسے "احسن تقویم" میں پیدا کرنے کا واضح مفہوم یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جس مقصد سے پیدا کیا ہے اور اسے اس دنیا میں جو فریضہ انجام دینے لئے بھیجا ہے ٹھیک اسی کے حسب حال اور حسب ضرورت اس کی فطرت بھی اس نے بنائی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اس مقصد اور فریضے کی انجام دہی کے لئے جن قوتوں اور صلاحیتوں کی اُسے ضرورت تھی، اور جن رجحانات و میلانات سے اس کا خمیر اُٹھایا جانا چاہیئے تھا، ان میں سے کسی ایک قوت یا کسی ایک رجحان سے بھی اسے محروم رکھا گیا ہو، یا ان قوتوں اور رجحانوں کے علاوہ کچھ زائد قوتیں اور رجحانات بھی اس کے اندر پیدا کر دیئے گئے ہوں۔

ایک طرف تو انسانی فطرت کی حیثیت اسلام کی نگاہ میں یہ ہے، دوسری طرف اس دین کا کہنا یہ ہے کہ میں، اور صرف میں ہی، وہ شاہراہ ہوں جس پر چل کر انسان اپنے مقصد وجود کو ٹھیک ٹھیک پورا کر سکتا اور اپنے فریضۂ حیات کو صحیح طور پر بجا لا سکتا ہے۔ ایسی حالت میں یہ عقل کا بدیہی تقاضا ہوگا کہ اسلام انسانی فطرت کو ذرا بھی نظر انداز

نہ کرے، بلکہ اس کی بنیاد ٹھیک اسی فطرت پر ہو اور اس کی تعلیمات در اصل اسی فطرت کے مجمل تقاضوں کی تفصیل اور اسی کی مبہم صداؤں کی توضیح ہوں۔ کتاب الٰہی اور ارشاداتِ رسولؐ سے معلوم ہوتا ہے کہ عقل کا یہ تقاضا غلط نہیں۔ حقیقتِ واقعہ یہی ہے کہ اسلام، انسانی فطرت کو بال برابر بھی نظر انداز نہیں کرتا، اور اس کی بنیاد کاملتہً اسی فطرت پر قائم ہے۔ قرآن مجید میں ہے:-

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا	ہر طرف سے کٹ کر اپنے رُخ کو اس
فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ	دین کی طرف سیدھا کر لو۔ اللہ کی
عَلَيْهَا۔	(بنائی ہوئی) اس فطرت کی پیروی کرو
(الروم۔ ۳۰)	جس پر اس نے (تم) انسانوں کو پیدا کیا ہے

یہ اس حقیقت کا واضح اعلان ہے کہ اسلام کی بنیاد جس شے پر رکھی گئی ہے وہ وہی فطرت ہے جس پر انسان پیدا کیا گیا ہے۔

قرآن حکیم نے اپنے کو، یا یوں کہئے کہ اسلام کو' جا بجا' ذکر'، 'تذکرہ'، اور 'ذکریٰ' کہا ہے، جس کے لغوی معنیٰ 'یاد دہانی' کے ہیں۔ قرآن یا اسلام کے 'یاد دہانی' ہونے کا مطلب یہ ہے' اور یہی ہو سکتا ہے کہ وہ کوئی ایسی چیز نہیں جو انسان پر کہیں سے لا کر لاد دی گئی ہو، اور جس سے وہ یکسر اجنبی رہا ہو، بلکہ ایک ایسی چیز ہے جس کی بنیادیں اس کے اندرون میں روز اوّل سے موجود ہیں، وہ اس کی فطرت ہی کی خاموش آواز ہے، جسے الفاظ کے اندر منتقل کر کے اس کے سامنے رکھ دیا گیا ہے، اس خاموش آواز کو وہ سُن نہیں رہا تھا اور اپنے اندر کی موجود اس حقیقت کو وہ بھُلا چکا تھا، رحمت حق نے اس بھلائے ہوئے سبق کو اسے یاد دلایا۔ اسلام کی یہی وہ حیثیت ہے جس کے پیش نظر وہ اپنے انکار کو "کفر" سے تعبیر کرتا ہے۔ 'کفر' کے لغوی معنی ہیں 'چھپا دینا'، گویا اسلام کا انکار در اصل اپنی اُس فطرت کو چھپا دینا اور

اور اُس کے رُخِ زیبا پر حق ناپسندی کی سیاہ نقاب ڈال دیتا ہے جس پر انسان کو پیدا کیا گیا ہے۔

اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ :

مَامِنْ مُوْلُوْدٍ یُوْلَدُ اِلَّا عَلَی	کوئی بچہ نہیں جو 'فطرت' پر نہ پیدا کیا
الْفِطْرَۃِ فَاَبَوَاہُ یُھَوِّدَانِہٖ	کیا گیا ہو، لیکن (اکثر و بیشتر ہوتا یہ ہے
اَوْیُنَصِّرَانِہٖ اَوْیُمَجِّسَانِہٖ	کہ) اس کے والدین اسے یہودی یا
(بخاری)	نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔

یعنی فطرتِ انسانی کو ربط و مناسبت صرف اسلام سے ہے۔ ہر بچہ بڑا ہونے پر اسلام ہی کو اختیار کرتا، اگر اس سلسلہ میں باہر سے کوئی مداخلت نہیں ہوتی۔ لیکن یہ مداخلت بالعموم لازماً ہوتی ہے، اور وہ اس طرح کہ اس کے والدین اس کے دل و دماغ پر پالنے ہی سے اپنے مذہب کی پالش چڑھانے لگتے ہیں۔ اس لئے بڑا ہوتے ہوتے وہ یہودی یا نصرانی یا مجوسی یا کسی اور قسم کا نامسلم بن کر رہ جاتا ہے۔ ورنہ اگر کسی بچے کے بارے میں یہ مداخلت نہ ہو، اس کے ماحول کی غیر معمولی طاقت اسے کسی طرف کھینچ نہ لے جائے، اور اس کی اصل فطرت کو اپنی پیدائشی حالت پر آزاد باقی رہنے دیا جائے، اور پھر اس کے سامنے مختلف مذاہب کی تعلیمات ایک ساتھ پیش کی جائیں تو وہ ان تمام میں سے صرف اسلام کو اپنائے گا، مذاہب کے اس مجموعے میں جب اس کی نظر اسلام پر پڑے گی تو وہ اس کی طرف اس طرح جا لپکے گا جس طرح ایک بچہ بہت سی عورتوں کے درمیان صرف اپنی ماں کی طرف لپکتا ہے۔ ایسا اس لئے ہوگا کہ ہر دوسرا مذہب انسانی فطرت کی شاہراہ سے ہٹا ہوا ہے۔ اس لئے جس کسی کی فطرت کو والدین کی تعلیم و تربیت اور ماحول کے اثر نے ہاتھ نہ لگایا ہو وہ ان مذاہب میں اپنے لئے کوئی کشش نہ پائے گا، بلکہ ان سے بے گانگی اور اجنبیت محسوس کرے گا۔ البتہ

اسلام کی طرف کھنچ آئے گا، کیونکہ اسے وہ اپنی فطرت کے عین مطابق پائے گا، اس سے گہرا انس اور ایک جان نواز ہم آہنگی محسوس کرے گا۔ گویا اس کی فطرت اگر خالص فولاد ہے تو اسلام اس کے لئے مصفّیٰ مقناطیس ثابت ہوگا۔

ان نصوص اور دلائل کی روشنی میں اس حقیقت پر کوئی پردہ نہیں رہ جاتا کہ اسلام فطرت کا ترجمان ہے اور اس کی بنیاد اسی فطرت پر رکھی گئی ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی اس بات کی صراحت فرمادی ہے کہ " وہ فطرت جس پر انسان کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے اس کا یہی دین ہے" (فطرۃ اللہ التی فطر النّاس علیہا دین اللہ تعالیٰ۔ روح المعانی، جزو ۲۱، صنہ ۴)

دین فطرت ہونے کا واضح تقاضا

اگر اسلام دینِ فطرت ہے اور اس کی بنیاد ٹھیک انسانی فطرت پر قائم ہے، اور اگر انسان کی فطرت میں صرف وہی قوتیں اور رجحانات پیدا کئے گئے ہیں جن کا اس کے مقصدِ وجود نے زبانِ حال سے مطالبہ کیا تھا، تو ان دونوں باتوں کا یہ لازمی اور بدیہی تقاضا ہوگا کہ اسلام انسان کی کسی بھی فطری قوت یا رجحان کے کچل ڈالنے کا روادار نہ ہو، کسی کو اپنی راہ کا روڑا نہ سمجھے۔ کسی کے جائز تقاضوں کو نہ ٹھکرائے، اور کسی سے خدمت لینے میں کوتاہی نہ کرے۔ کیونکہ اس کے لئے ایسا کرنا اگر صحیح ہو سکتا ہے تو صرف اسی وقت جب کہ اُسے تین باتوں میں سے کوئی نہ کوئی بات ضرور تسلیم ہو۔

۱۔ یا تو یہ بات کہ اس کی بنیاد ٹھیک انسانی فطرت پر نہیں ہے۔

۲۔ یا یہ بات کہ انسانی فطرت میں اس کے خالق نے کچھ ایسی چیزیں بھی پیدا کر رکھی ہیں جو انسان کے مقصدِ وجود کے لئے یکسر غیر ضروری بلکہ ضرر رساں ہیں۔

۳۔ یا پھر یہ بات کہ وہ انسان کے ادائے فرض اور سچی کامیابی کی صراطِ مستقیم دکھلانے

آیا ہی نہیں ہے۔

لیکن جب وہ ان میں سے کسی بات کے بھی تسلیم کرنے پر تیار نہیں، بلکہ انھیں دنیا کی سب سے زیادہ غلط اور جھوٹی باتیں قرار دیتا ہے تو ایسی حالت میں عقل یہ کہنے پر مجبور ہو گی کہ پھر تو اسلام کا رویہ ایک ایک قوت و رجحان فطرت کے بارے میں لازماً مثبت اور تعمیری ہونا چاہیئے، اور ضروری ہے کہ ان سب کا وہ احترام کرے، ان کے جائز مطالبات کو تسلیم کرے، انسانی زندگی کے حقیقی مقصد کے حصول میں انھیں کار آمد سمجھے، اور ان سے کام لینے کی ہدایت کرے۔

جس شخص کی بھی نگاہ اسلامی تعلیمات پر سطحی نہ ہو گی وہ شہادت دے گا کہ اسلام کا رویہ، عقل کے اس فیصلے سے ذرا بھی مختلف نہیں۔ وہ انسان کی ساری فطری قوتوں اور رجحانوں کو بالیقین یہی حیثیت دیتا ہے، انھیں لحاظ و احترام کا مستحق ٹھیراتا ہے، ان کے تقاضے پورے کرنے کی ہدایتیں دیتا اور اس کے لئے راہیں متعین کرتا ہے، اور اس بات کی شدت سے مخالفت کرتا ہے کہ انھیں معیوب سمجھ کر نظر انداز کر دیا جائے۔ پھر اس کا یہ رویہ اور یہ طرز فکر ان قوتوں اور رجحانوں کے ساتھ کسی رعایت کی خاطر اور کسی منفی بنیاد پر نہیں ہے۔ وہ محض اس وجہ سے ان کی پذیرائی نہیں کرتا کہ جب انسان "یہ علتیں" ساتھ لے کر پیدا ہوا ہے تو کچھ ان کی بھی مان لی جائے۔ بلکہ ٹھیک اپنے تصور دین کے تحت ایسا کرتا ہے۔ اس کے نزدیک یہ قوتیں اور یہ رجحانات ایسے ذرائع ہیں جن سے ٹھیک ٹھیک کام لے کر ہی انسان اپنے مقصد وجود کو حسن و خوبی کے ساتھ پورا کر سکتا ہے۔ اور اسی لئے وہ ان کے مطالبات کی صحیح بجا آوری کو دنیا کا نہیں، بلکہ دین کا کام اور عبادت کا فعل قرار دیتا ہے۔ مثال کے طور پر انسان کے اندر کھانے پینے کی، جسمانی آرام و سکون کی بقائے نسل کی، بیوی بچوں کی پرورش و نگہداشت کی، احباب کی خاطر مدارات کی فطری

خواہشیں موجود ہیں، اسی طرح وہ غصّہ، نفرت، سختی، جنگ، شہوت، گویائی، احساسِ مسرت اور احساسِ غم کی قوتیں لے کر پیدا ہوا ہے۔ بظاہر دیکھئے تو یہ ساری چیزیں دین اور دینداری کے ذوق سے کوئی میل نہیں کھاتیں بلکہ ان میں سے بیشتر تو ایسی ہیں جو اس کی عین ضد کہی جائیں گی۔ مگر اسلام کہتا ہے کہ ــــــــ نہیں، یہ سب انسانی فطرت کے جوہر ہیں، اور ان میں سے کوئی چیز بھی بے قیمت یا بلا ضرورت نہیں۔ انسان پر جس طرح اس کے خالق اور پروردگار کے حقوق ہیں، اسی طرح اس کے اپنے نفس کے، اپنے جسم کے، اپنی آنکھوں کے، اپنے اہل وعیال کے، اور اپنے احباب کے بھی حقوق ہیں، اور ضروری ہے کہ ان سارے حقوق کو ادا کیا جائے۔ (اِنَّ لِجَسَدِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَ اِنَّ لِعَيْنِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَ اِنَّ لِزَوْجِكَ حَقًّا وَ اِنَّ لِزَوْرِكَ حَقًّا ــــــــ اِنَّ لِرَبِّكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَّ لِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَّ لِاَهْلِكَ عَلَيْكَ حَقًّا[1] ــــــــ اِنَّ لِرَبِّكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَّ لِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَّ لِاَهْلِكَ عَلَيْكَ حَقًّا فَاَعْطِ كُلَّ ذِيْ حَقٍّ حَقَّهٗ۔[2] حتیٰ کہ خود اپنی ذات کے اوپر اور اپنے اہل وعیال پر خرچ کرنا بھی کارِ ثواب ہے، (اِبْدَءْ بِنَفْسِكَ فَتَصَدَّقْ عَلَيْهَا[3] ــــــــ مَهْمَا اَنْفَقْتَ فَهُوَ لَكَ صَدَقَةٌ حَتَّى اللُّقْمَةَ تَرْفَعُهَا فِيْ فِيْ امْرَاَتِكَ[4]) جو شخص جوشِ ریاضت میں آکر مسلسل روزے رکھتا رہے گا وہ ایسا غلط کار ٹھیرے گا گویا اس نے روزے رکھے ہی نہیں، (لَا صَامَ مَنْ صَامَ الْاَبَدَ[5]) نکاح کرنا ہی دین کا تقاضا ہے اور اس سے اعراض کرنے والا رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق رکھنے کا مستحق نہیں۔

---

[1] بخاری کتاب الصوم [2] بخاری، کتاب الصوم [3] مسلم کتاب الزکوٰۃ [4] بخاری کتاب النفقات [5] بخاری کتاب الصوم۔

(اَتَزَوَّجُ النِّسَاءَ فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّیْ[1]) انسان میں اولاد کی طلب ہونا چاہیے، (وَابْتَغُوْا مَا کَتَبَ اللّٰہُ لَکُمْ[2] ــــ تَزَوَّجُوا الْوَدُوْدَ الْوَلُوْدَ[3]) مثالی مومنوں، یعنی انبیا علیہم السّلام کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ صاحبِ اہل وعیال تھے، (وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّیَّةً[4]) مومن کے لئے ازدواجی وظیفے کی ادائی میں بھی اجر وثواب ہے، (فِیْ بُضْعِ اَحَدِکُمْ صَدَقَةٌ[5]) حق اور دین کے معاملے میں، اپنے موقع پر، بغض اور نفرت کمالِ ایمان کی ضروری علامت ہے، (مَنْ اَحَبَّ لِلّٰہِ وَاَبْغَضَ لِلّٰہِ وَاَعْطٰی لِلّٰہِ وَمَنَعَ لِلّٰہِ فَقَدِ اسْتَکْمَلَ الْاِیْمَانَ[6]) اگر دین کی حفاظت اور حمایت کا تقاضا ہو تو اس کی خاطر جنگ بہترین نیکی ہے، (قِیْلَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اَیُّ النَّاسِ اَفْضَلُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مُؤْمِنٌ یُّجَاھِدُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ بِنَفْسِہٖ وَمَالِہٖ[7]) اور اس قسم کی جنگ کے جذبے سے اگر کوئی سینہ خالی ہے تو وہ ایک سچے مسلمان کا سینہ نہیں ہو سکتا، (مَنْ مَّاتَ وَلَمْ یَغْزُ وَلَمْ یُحَدِّثْ بِہٖ نَفْسَہٗ مَاتَ عَلٰی شُعْبَةٍ مِّنْ نِفَاقٍ[8]) کفر اور نفاق کے معاملے میں نرمی کا نہیں بلکہ سختی کا رویہ، ایمان کی جان ہے، (مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ[9]) قوّتِ گویائی کو معطل کئے رہنا اسلام کا نہیں، جاہلیت کا کام ہے، (اِنَّ ھٰذَا لَا یَحِلُّ ھٰذَا مِنْ عَمَلِ الْجَاھِلِیَّةِ[10])

---

[1] بخاری، کتاب النکاح [2] سورۂ بقرہ [3] ابوداؤد، کتاب النکاح [4] سورۂ رعد۔
[5] مسلم، کتاب الزکوٰۃ [6] مشکوٰۃ ص۱۲ بحوالہ ابوداؤد [7] بخاری، کتاب الجہاد۔
[8] مسلم جلد ۲ [9] سورۂ فتح [10] بخاری جلد دوم۔

اپنے بچوں کو پیار کرنا ایک پسندیدہ عادت اور دینی ذوق کی بات ہے اور اپنے کو اس سے "بلند" رکھنا سخت ناپسندیدہ رویہ ہے (قَبَّلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْحَسَنَ بْنَ عَلِيٍّ۔ فَقَالَ مَنْ لَا يَرْحَمُ لَا يُرْحَمُ[1]) اپنے کسی عزیز کی موت پر غم گین ہونا اور آنسو بہانا کوئی غیر مستحسن فعل نہیں بلکہ انسانیت و رحم دلی کا مظاہرہ ہے (..... هٰذِهٖ رَحْمَةٌ جَعَلَهَا اللهُ فِي قُلُوْبِ عِبَادِهٖ[2])

یہ ساری شہادتیں اس بات کو قطعی طور پر ایک روشن اور ناقابلِ انکار حقیقت ثابت کر دیتی ہیں کہ اسلام فطری قوتوں اور میلانوں کو معیوب قرار نہیں دیتا، بلکہ معیوب اس بات کو قرار دیتا ہے کہ انھیں اچھی نظروں سے نہ دیکھا جائے، انھیں ٹھکرایا جائے، اور ان کے حرکت میں آنے کو دین داری کے خلاف سمجھا جائے۔ وہ اسی خالقِ حکیم کی طرف سے آیا ہوا دین ہے جس نے انسان کو اور اس کی ساری فطری قوتوں کو خلق کیا ہے۔ اس لئے اس کے لئے یہ کسی طرح ممکن تھا ہی نہیں کہ وہ ان میں سے کسی ایک قوت کو بھی فضول اور بے کار قرار دیتا۔ دین اللہ اور دین فطرت ہونے کی حیثیت سے بنیادی طور پر اس کا تو مقصدِ وجود ہی یہ ہونا چاہیئے کہ انسان کی فطری قوتوں اور رجحانوں سے کام لینے میں اس کی رہنمائی کرے، اسے ان کے غلط استعمال سے روکے اور صحیح استعمال کے طریقے بتائے، نہ صرف طریقے بتائے بلکہ اس کی تلقین بھی کرے، اور سچ پوچھئے تو یہی وہ سب سے بڑی مخصوص صفت ہے جو دین اللہ کو دوسرے دینوں سے اور اسلام کو غیر اسلام سے ممتاز کرتی ہے۔

جب اسلام، دین فطرت ہونے کے باعث، انسان کے ایک ایک فطری رجحان

---

[1] بخاری کتاب الآداب [2] مسلم، کتاب الجنائز۔

کو توجہ کے لائق ٹھیراتا ہے، اسے احترام کی نظر سے دیکھتا ہے، اس کے وجود کے پیچھے کسی نہ کسی مصلحت اور ضرورت کی کارفرمائی تسلیم کرتا ہے، اور اس بنا پر اس کے صحیح تقاضوں کی تکمیل کو اپنی تعلیمات میں لازماً جگہ دیتا ہے ـــــ تو کوئی وجہ نہیں کہ ایک اجتماعیت پسندی ہی کے رجحان کو، جو بجائے خود انسانی فطرت کا بڑا ہی نمایاں اور قوی رجحان ہے، اس نے مذموم و مردود قرار دے دیا ہو یا اسے نظر انداز کر دیا ہو۔ یہ بات کسی طرح قیاس میں آنے والی نہیں۔ اس کے برعکس، قیاس کا کہنا تو صرف یہ ہے کہ اس نے انسان کے اس فطری رجحان کو بھی، اس کے مقصد وجود کے بارے میں یقیناً ایک ضرورت کی چیز سمجھا ہو گا، اور اپنی تعلیمات کے اندر اس کے تقاضوں کو بھی وہی جگہ دی ہو گی جس کے وہ مستحق ہیں، نیز ایسے شخص کو اپنا ایک غلط کاریر و ٹھیرایا ہو گا جو 'مسلم' ہوتے ہوئے بھی اس کی اس طرح کی تعلیمات کو مناسب اہمیت نہ دے اور ان کا پورا پورا حق ادا کرنے سے کترا جائے ـــــ اور اگر امر واقعی یہ نہیں ہے، اگر اس نے اجتماعیت کے بارے میں یہ رویہ اختیار نہیں کیا ہے تو کوئی شک نہیں کہ عقل و انصاف کی عدالت اس پر بے اصولی اور تضاد پسندی کا شدید الزام لگائے گی، اور اس الزام کی صفائی میں اس کے لئے کچھ کہنا آسان نہ ہو گا۔

آئیے دیکھیں، اپنے دینِ فطرت ہونے کے اس واضح اصولی مطالبے کو اسلام نے کس حد تک تسلیم کیا ہے؟ اور اجتماعیت کو اس کے یہاں فی الواقع کیا مقام ملا ہوا ہے؟

اجتماعیت کی تسلیم شدہ دینی اہمیت

کتاب و سنّت پر جائزے کی ایک اچٹتی نظر بھی اس بات کا یقین دلا سکتی ہے کہ اسلامی نظام فکر و عمل سے اجتماعیت کو بے دخل نہیں رکھا گیا ہے، بلکہ اس کی اہمیت کا صاف صاف اعتراف کیا گیا اور اس کے تقاضوں کو واضح طور پر تسلیم کیا

کیا گیا ہے۔ اور اگر جائزے کی نظر کو گہرائی میں اُتر کر کام کرنے کا موقع دیا جائے تو اس یقین کی وسعت کہیں سے کہیں جا پہنچے گی ـــــ دکھائی دے گا کہ اس نظام میں اجتماعیت کو وہ اہمیت حاصل ہے جو حیرت انگیز حد تک غیر معمولی ہے، جو شاید اپنی نظیر آپ ہی ہے۔ کوئی پہلو نہیں جو اس اہمیت کی توضیح و تلقین کے لئے اختیار کیا جا سکتا ہو اور یہاں اسے اختیار نہ کیا گیا ہو، کوئی موقع نہیں جہاں اجتماعی طرزِ عمل اپنانے کی گنجائش نکل سکتی ہو اور اسلام نے اس کی تاکید نہ کر رکھی ہو۔

اس دعوے کی دلیل، اور اس اجمال کی تفصیل ہمیں جن چیزوں سے ملے گی وہ یہ ہیں :۔

۱۔ اسلام کا عمرانی تصوّر، یعنی انسان کا وہ موقف جسے اس کا حقیقی عمرانی موقف تسلیم کر کے اسلام نے اسے خطاب کیا ہے۔

۲۔ وہ احکامِ شریعت جو اہل اسلام کی جماعتی تنظیم اور ملّی وحدت کے بارے میں وارد ہوئے ہیں۔

۳۔ وہ دینی ہدایتیں جن میں زندگی کے عام امور و معاملات کو بھی کسی نہ کسی طرح کے اجتماعی نظم کے ساتھ انجام دینے کی تلقین کی گئی ہے۔

۴۔ اجتماعیت کے وہ آداب جو فرض عبادتوں کے ضمن میں لازم ٹھہرائے گئے ہیں۔

آئیے ایک ایک چیز کو لے کر اس کا تفصیلی مطالعہ کریں :۔

(۱) عمرانی تصوّر کی زبان سے

کوئی بھی مذہب اپنے پیرووں کو جب خطاب کرتا ہے تو اپنے ذہن میں انسان کی اصل حیثیت کا کوئی نہ کوئی تعین ضرور رکھتا ہے، اور اسے کسی متعین موقف پر رکھ کر ہی اپنی تعلیمات کا آغاز کرتا ہے۔ یہ ایک ایسی بات ہے جس سے گریز نہ ممکن ہے نہ صحیح۔ کیونکہ یہ چیز بھی انہی چند چیزوں میں سے ایک ہے جو مذاہب کے اندازِ خطاب کی، ان کے احکام و ہدایات کی اور

اُن کی قدروں کی تعیین اور حد بندی کرتی ہیں، اور جن کا لحاظ اگر نہ رکھا جائے تو اُن کی تعلیمات کے اندر نہ کوئی توازن پیدا ہو سکتا ہے نہ کوئی معقولیت پائی جا سکتی ہے۔

جن اُمور میں انسان کی اصل حیثیت اور اس کے قدرتی و حقیقی موقف کا تعین ضروری ہوتا ہے، ان میں سے ایک عمرانیت بھی ہے۔ ہر مذہب کو یہ پہلے دن طے کرلینا پڑتا ہے کہ آیا انسان ایک ایسی مخلوق ہے جسے اپنی دنیا آپ بسانی اور تنہائی کی زندگی بسر کرنی ہے، یا اسے اپنے دوسرے ہم جنسوں کے ساتھ اور ان کے اندر رہنا سہنا ہے۔ اور اگر دوسروں کے ساتھ مل کر رہنا سہنا ہے تو اس میل جول کا دائرہ کتنا محدود یا کتنا وسیع، اور اس ربط کا رشتہ کتنا مضبوط ہے؟ قدرتاً اسلام نے بھی ان سوالوں کا ایک جواب متعین کر کے ہی انسان کو خطاب کیا ہے، اور اس معاملے میں بھی اسے ایک خاص مقام پر رکھ کر ہی اس نے اپنی تعلیمات وضع کی ہیں۔ یہ جواب کیا ہے؟ اور اسلام کے نزدیک عمرانی پہلو سے انسان کا حقیقی موقف کیا ہے؟ یہ معلوم کرنے کے لئے ایک طرف تو اس کا یہ ارشاد سنیئے۔

يَا اَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنَاكُمْ	لوگو! ہم نے تم سب کو ایک مرد اور
مِنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَجَعَلْنَاكُمْ	ایک عورت سے پیدا کیا ہے، اور تمہاری
شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ اَلخ (حجرات)	قومیں اور قبیلے بنائے ہیں۔ الخ

دوسری طرف اس کا یہ عمل دیکھئے کہ اس کی شریعت پر اجتماعیت کی انتہائی گہری چھاپ پڑی ہوئی ہے، اس کے احکام و ہدایات کا ایک خاصا بڑا حصّہ انسان کی اجتماعی زندگی کے لئے وقف ہے اور اس کی پیروی بھی اس نے اسی طرح لازمی قرار دی ہے جس طرح باقی دوسرے احکام کی، وہ جہاں حقوق اللہ سے بحث کرتا ہے وہیں حقوق العباد کو بھی پوری اہمیت سے لیتا ہے، وہ صرف پرستش کا طریقہ بتا کر خاموش نہیں ہو جاتا بلکہ اجتماعی زندگی بسر کرنے کے لئے ایک پورا نظامِ اطاعت بھی دیتا ہے، منزلی اور عائلی،

شہری اور ملکی، اخلاقی اور معاشرتی، تمدنی اور معاشی، سیاسی اور بین الاقوامی، غرض حیاتِ انسانی کا کوئی شعبہ نہیں جس کے سلسلے میں اس کے احکام موجود نہ ہوں، اور زندگی کی کوئی گذرگاہ نہیں جہاں اس کے ہدایت نامے آویزاں نہ ہوں۔

یہ دونوں اُمور ــــــ اسلام کا یہ صریح ارشاد اور اس کا یہ واضح عمل ــــــ جس امرِ واقعی کا انکشاف کرتے ہیں وہ کسی بحث و استدلال یا کسی وضاحت سے یکسر بے نیاز ہے۔ یہ دونوں بجائے خود اس بات کا کھلا ہوا اعلان ہیں کہ اسلام نے انسان کو خطاب کرتے وقت ایک ایسے مقام پر رکھا ہے جسے اجتماعیت کا اونچا مقام کہا جائے گا۔ اس کی تعلیمات کے پس منظر میں انسان کا جو موقف ایک مسلمہ حقیقی موقف کی حیثیت سے موجود ہے وہ قطعی طور پر ایک منظم اجتماعی زندگی بسر کرنے والی مخلوق کا موقف ہے، وہ انسانی افراد کا اس کے سوا اور کوئی تصوّر رکھتا ہی نہیں کہ یہ ایک 'قبیلے'، ایک 'قوم' اور ایک معاشرے کے اجزائے ترکیبی ہیں اور اپنے اسی 'کُل' کے اجزا بن کر زندگی بسر کرتے ہیں، گھر بار، کھیت اور بازار، علمی ادارے اور تحقیقاتی مراکز، اسمبلی اور پارلیمنٹ، میدانِ جنگ اور ایوانِ صلح، ہر جگہ کی دل بستگیاں اور ضرورتیں رکھتے ہیں۔ اس لئے جب بھی انھیں خطاب کرنا ہو ضروری ہے کہ ان کے اس مسلم اور حقیقی موقف کو سامنے رکھ کر خطاب کیا جائے

اگر اسلام انسان کو خطاب کرتے وقت اپنے ذہن میں اس کا عمرانی تصوّر یہ رکھتا ہے تو یہ اس بات کا بدیہی ثبوت ہے کہ وہ اپنے پیرووں کے لئے اجتماعیت کو ایک امرِ لازم سمجھتا ہے، اور اس حد تک لازم سمجھتا ہے کہ اگر انسان کو اس کی اس حیثیت سے الگ کر دیا جائے تو پھر اس زمین پر اس کا کوئی صحیح مخاطب ہی باقی نہیں رہ جاتا۔

(۲) تنظیمی احکام کی زبان سے

کوئی شک نہیں کہ اسلام نے فرد کو بڑی اور بنیادی اہمیت دی ہے۔ فرد ہی اس کا

ابتدائی اور حقیقی مخاطب ہے۔ جس طرح وہ تنہا پیدا ہوا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کے احکام و مرضیات پر چل کر اپنی زندگی کو کامیاب بنانا بھی اسی کی اپنی انفرادی ذمہ داری ہے، اور کل اس کے حضور اپنے عمل کی جواب دہی کے لئے اسے اکیلے ہی حاضر ہونا بھی ہے ـــــــ لیکن اسی کے ساتھ اس کا کہنا یہ بھی ہے کہ وہ راستہ جو انسان کو کامیابی کی منزلِ مقصود تک پہنچاتا ہے، اجتماع سے کترا کر نہیں جاتا، بلکہ ایک منظم اجتماعی زندگی کے ٹھیک منجدھار سے ہو کر گزرتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید اس "راستے" کی تعیین کرتے ہوئے اس کے ضروری مراحل کے سلسلے میں فرماتا ہے کہ :۔

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا....	اے ایمان والو..... اور تم سب
وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا	کے سب اللہ کی رسی کو مضبوطی
وَّلَا تَفَرَّقُوْا۔ (آل عمران)	سے پکڑ لو اور الگ الگ نہ رہو۔

"الگ الگ نہ رہو" یعنی باہم جڑے ہوئے رہو۔ یہ "الگ الگ نہ رہنا" اور "باہم جڑا رہنا" کس طرح کا اور کس معیار کا ہونا چاہیئے، اس کی وضاحت کے لئے صاحبِ قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی طرف رجوع کیجئے۔ آپؐ فرماتے ہیں کہ :۔

عَلَیْکُمْ بِالْجَمَاعَۃِ وَاِیَّاکُمْ	جماعت کے دامن کو مضبوطی سے تھامے رہو
وَالْفُرْقَۃَ۔ (ترمذی ج ۲ ص۳۹)	اور انتشار سے پوری طرح الگ رہو۔
آمُرُکُمْ بِخَمْسٍ بِالْجَمَاعَۃِ	میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دیتا
وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَۃِ وَالْھِجْرَۃِ	ہوں :۔ جماعتی[1] زندگی کا، سمع[2]
وَالْجِھَادِ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ۔	یعنی احکام امیر کے سننے کا طاعت[3]
	(یعنی احکام کے ماننے) کا، ہجرت[4]
(احمد و ترمذی بحوالہ مشکوٰۃ ص۳۲۱)	کا اور جہاد فی سبیل اللہ کا۔

ان حدیثوں سے معلوم ہوا کہ جس جماعتی زندگی کا حکم اسلام نے دیا ہے وہ کوئی

ڈھیلی ڈھالی جماعتی زندگی نہیں ہے جس کی شیرازہ بندی صرف اخلاقی رشتوں سے ہوئی ہو، بلکہ ایسی متحد، منظم اور منضبط جماعتی زندگی ہے جس کو سمع اور طاعت کے آہنی تاروں سے بھی پوری طرح کس دیا گیا ہو۔

پھر یہی نہیں کہ 'جماعت' کے دامن کو مضبوطی سے تھامے رہنے اور جماعتی زندگی بسر کرنے کا یہ ایک لازمی حکم ہے، بلکہ یہ ایسا لازمی حکم ہے جس کی خلاف ورزی میں نہ ایمان کی خیر ہے نہ اسلام سے رشتہ برقرار رہ سکتا ہے، چنانچہ مزید ارشاد ہوتا ہے کہ:

اِنَّہٗ مَنْ خَرَجَ مِنَ الْجَمَاعَةِ قِيْدَ شِبْرٍ فَقَدْ خَلَعَ رِبْقَةَ الْاِسْلَامِ مِنْ عُنُقِہٖ (ایضًا)	جو شخص 'الجماعۃ' سے بالشت بھر بھی الگ ہو رہا، کوئی شک نہیں کہ اس نے اسلام کا حلقہ اپنی گردن سے نکال پھینکا۔
مَنْ خَرَجَ مِنَ الطَّاعَةِ وَفَارَقَ الْجَمَاعَةَ فَمَاتَ مَاتَ مِيْتَةً جَاهِلِيَّةً۔	جو کوئی امام المسلمین کی اطاعت سے کنارہ کشی اختیار کرے گا اور جماعت المسلمین سے الگ ہو رہے گا

(مسلم ج ۲ صـ۱۲۷) اور اسی حال میں مر جائے گا، اس کی موت جاہلیت کی موت ہو گی۔

جس طرح مسلمانوں کی "الجماعۃ" سے اپنا جڑا ہوا رشتہ کاٹ لینا ایمان کے منافی ہے اسی طرح اس نظمِ اجتماعی سے وابستہ نہ ہونا بھی دینی حیثیت سے انتہائی خطرناک حالت ہے۔

مَنْ مَاتَ ولیس فی عنقه بَيْعَةٌ مات مِيْتَةً جاهليةً۔ (مسلم ج ۲ صـ۱۲۸)	"جو شخص اس حال میں مر جائے کہ اس کی گردن میں (امام المسلمین کی) بیعت (کا قلاوہ) نہ ہو اس کی موت جاہلیت کی موت ہو گی۔"

جس 'الجماعۃ' کی حیثیت یہ ہو اور جس نظمِ اجتماعی سے علیحدگی یا بے تعلقی ایک مسلمان

کو جاہلیت کی حالت میں پہنچا دیتی ہو، کوئی وجہ نہیں کہ اس کے اندر رخنہ ڈالنے کی کسی جسارت کو ایک لمحے کے لئے بھی برداشت کر لیا جائے۔ چنانچہ اس بارے میں آپؐ کی ہدایت یہ ہے کہ:

مَنْ اَرَادَ اَنْ یُّفَرِّقَ اَمْرَ	جو شخص اس جماعۃ کو جب کہ وہ متحد ہو،
هٰذِهِ الْجَمَاعَةِ وَهِيَ جَمِيْعٌ	پراگندہ کرنا چاہے اسے (بدرجۂ آخر)
فَاضْرِبُوْهُ بِالسَّيْفِ كَائِنًا مَنْ	تلوار پر رکھ لو، خواہ وہ کوئی بھی ہو۔
كَانَ۔ (مسلم ج ۲ صـ۱۲۸)	

دوسری طرف، قدرتی طور پر ان لوگوں کا اجر اور مرتبہ قابلِ رشک حد تک عظیم قرار دیا گیا ہے، جو اس نظمِ اجتماعی کی عملی شکل ـــــ اسلامی مملکت ـــــ کی حفاظت اور سالمیت کے لئے جاں بازیاں دکھائیں۔ فرمایا گیا ہے کہ:۔

"ایک شب و روز کی سرحدوں کی حفاظت ایک مہینے کے مسلسل روزوں اور نمازوں سے بھی افضل ہے۔ اور اگر اسی دوران کسی کی وفات ہو جائے تو اس کا وہ عمل نیک جسے وہ اپنی زندگی میں انجام دیا کرتا تھا، برابر انجام پاتا ہوا شمار کیا جائے گا، اور اسے اس کا رزق ملتا رہے گا، نیز وہ فتنے میں ڈالنے والوں سے مامون رہے گا۔" (مسلم جلد دوم صـ۱۴۲)

"دو آنکھوں کو دوزخ کی آگ نہ چھو سکے گی:۔ ایک وہ جو خوفِ خدا سے رو پڑی ہو، دوسری[۲] وہ جس نے رضائے الٰہی کی خاطر سرحدوں کی نگرانی کرتے ہوئے رات گذار دی ہو۔" (ترمذی جلد اول صـ۲۱)

اسی طرح اس نظم کی اطاعت کو ایمان کی ایک ضروری علامت بنایا گیا ہے، اور اصحابِ امر کی فرماں برداری کو اللہ و رسولؐ کی فرماں برداری قرار دیا گیا ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم

فرماتے ہیں کہ:

مَنْ یُّطِعِ الْاَمِیْرَ فَقَدْ	جس نے امیر کی فرماں برداری کی اس
اَطَاعَنِیْ وَمَنْ یَّعْصِ	نے میری فرماں برداری کی اور جس
الْاَمِیْرَ فَقَدْ عَصَانِیْ۔	نے امیر کی نافرمانی کی اس نے میری
(مسلم ج ۲۔ ص ۱۲۴)	نافرمانی کی۔

'اطاعتِ امیر' کے اس فریضے کو امکان کی آخری حد تک انجام دینے کی تاکید کی گئی ہے۔ یہاں تک کہ اُن اُمراء کی بھی بیعت اور اطاعت سے کنارہ کشی کی اجازت نہیں ہے جو بُرائیوں میں لت پت ہو رہے ہوں اور جن کے ہاتھوں رعایا کی پیٹھیں زخموں سے چور چور ہو جاتی ہوں۔ حالانکہ یہ وہ حرکتیں ہیں جو اسلام کی نگاہ میں انتہائی حد تک مبغوض ہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنے پیرووں سے کہتا ہے کہ صبر سے ان مظالم کو برداشت کئے جاؤ اور ان کی امارت کو چیلنج نہ کرو، بلکہ معروف میں ان کی برابر اطاعت کرتے رہو۔ اس معاملے میں ایسی غیر معمولی چشم پوشی کی پالیسی اس نے کیوں اختیار کی ہے؟ اور ظالم و فاسق امراء کے بارے میں ایسے انتہائی صبر و انقیاد کا اس نے مسلمانوں کو کیوں حکم دیا ہے؟ محض اس لئے تاکہ ملّت کی اجتماعیت محفوظ رہے اور مسلمانوں کا اتحاد انتشار کی نذر نہ ہونے پائے۔ امام نودیؒ اس طرح کی حدیثوں پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

هٰذِهِ الاحادیث فی الحث	یہ حدیثیں اس امر کی تاکید کے بارے میں
علی السّمع والطاعة	وارد ہوئی ہیں کہ اولوالامر کے احکام
فی جمیع الاحوال وسببها	ہر حال میں سنے اور مانے جائیں، اور
اجتماع کلمة المسلمین	ان کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کا اتحاد

فان الخلاف سبب لفساد احوالھم فی دینھم ودنیاھم (شرح مسلم ج ۲ ص ۱۲۴)

برقرار رہے، کیونکہ اختلاف ان کے لئے دینی اور دنیوی دونوں قسم کی خرابیِ احوال کا موجب ہے۔

یہ ان احکام کا ایک مجمل خلاصہ ہے جو اجتماعی نظم اور ملی اتحاد کے بارے میں اسلام نے اپنے پیروؤں کو دے رکھے ہیں۔ اگر صرف انہی چند ارشادات کو غور سے دیکھ لیا جائے تو اجتماعیت کی وہ قدر و اہمیت جو اسے اسلام میں حاصل ہے، بڑی حد تک بے حجاب نظر آجائے گی۔ کتاب و سنّت کی رُو سے اگر تمام اہلِ ایمان کا ایک خاص شیرازے (حَبْلُ اللہ) میں بندھا رہنا اور 'تفرق' سے دور رہنا ضروری ہے؛ اگر مسلمانوں پر نظامِ خلافت کا قائم کرنا واجب ہے[1]، اگر امام المسلمین کی اطاعت اللہ اور رسولؐ کی اطاعت ہے، اگر جماعۃ المسلمین سے بالشت بھر کی علیحدگی بھی مومن کی گردن کو اسلام کے حلقے سے محروم کر دیتی ہے، اگر امام کی بیعت سے بے نیاز مر جانا جاہلیت کی موت مرنا ہے، اگر الجماعۃ کے اتحاد میں رخنے ڈالنے والے کے خون کی کوئی قیمت نہیں، اور اگر ملت کے اجتماعی نظام (اسلامی مملکت) کی حفاظت سے بڑی کوئی عبادت نہیں ــــــ تو سوچئے وہ کون سا مقام ہے جو اجتماعیت کو ملنا چاہئیے تھا لیکن اسلام میں اُسے ملا نہیں ہے۔

(۳) عام اجتماعی ہدایات کی زبان سے

'اجتماعیت' اور 'اجتماعی نظام زندگی' کے الفاظ جب بولے جاتے ہیں تو عام طور سے ان کا اونچے سے اونچا اور وسیع سے وسیع مفہوم بھی ایک باضابطہ نظامِ حکومت کے قیام سے زیادہ نہیں ہوتا۔ گویا عام معاشروں کی حد تک یہی اجتماعیت

---

[1] نصبِ خلافت کے واجب ہونے پر امت کا اجماع ہے۔ اس مسئلے پر مفصّل گفتگو ایک مستقل عنوان کے تحت آگے آتی ہے۔

کا معیار مطلوب اور منتہائے کمال سمجھا جاتا ہے، اور حکومت کے دائرۂ عمل واثر سے باہر کی باقی پوری زندگی اجتماعیت کی بحث سے یکسر آزاد اور بے تعلق خیال کی جاتی ہے۔ لیکن اسلام اس عام نقطۂ نظر سے اتفاق نہ کرتے ہوئے آگے بڑھتا ہے، اور اپنے پیروؤں کو، حکومتی دائرۂ عمل واثر سے باہر کی زندگی بھی، کسی نہ کسی طرح کے اجتماعی نظم کے ساتھ ہی بسر کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ اس سلسلے میں اس نے جو ہدایات دی ہیں ان کا ایک ترتیب سے مطالعہ کیجئے:۔

(۱) حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

لَا يَحِلُّ لِثَلَاثَةٍ يَكُونُونَ	ایسے تین آدمیوں کے لئے، جو کسی بیابان
بِفَلَاةٍ مِنَ الْأَرْضِ إِلَّا أَمَّرُوا	میں ہوں، جائز صرف یہ بات ہے کہ وہ
عَلَيْهِمْ أَحَدَهُمْ (منتقی صہ ۲۳۰)	اپنے میں سے ایک کو اپنا امیر بنا کر رہیں۔

یہ ارشاد نبوی کہتا ہے کہ اگر تین مسلمان بھی کسی جگہ ہوں، حتیٰ کہ اگر وہ کسی الگ تھلگ مقام اور سنسان بیابان ہی میں کیوں نہ آباد ہوں، تو بھی ضروری ہے کہ ان میں سے ایک ان کا امیر ہو اور باقی دو اس کے مامور و ماتحت ہوں۔ اس اجتماعیت اور تنظیم کے، بلکہ یوں کہیئے کہ اس ننھے سے "ریاستی نظم" کے بغیر ان کی زندگی اسلامی زندگی نہ ہوگی۔

(۲) حضرت ابو سعید خدریؓ بیان کرتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا ہے:۔

إِذَا خَرَجَ ثَلَاثَةٌ فِي سَفَرٍ	جب تم میں سے تین آدمی بھی سفر کے
فَلْيُؤَمِّرُوا أَحَدَهُمْ	لئے نکلیں تو چاہیئے کہ ایک کو
(ابوداؤد، جلد ا صہ ۳۵۱)	اپنا امیر بنا لیں۔

یعنی مسلمان کے لئے ہدایت یہ ہے کہ مدتِ سفر جیسا عارضی وقت بھی نظم وامر کے بغیر نہ گزارے۔ اگر تین اشخاص بھی ایک ساتھ سفر کر رہے ہوں تو مزاج اسلامی کے

سراسر خلاف ہوگا اگر انھوں نے اپنے میں سے ایک کو اپنا امیر سفر نہ بنا لیا ہو، اور اس کی سرکردگی میں وہ یہ سفر نہ کر رہے ہوں۔

(۳) حضرت ابو ثعلبہ خشنیؓ کہتے ہیں کہ لوگوں کی عادت تھی کہ سفر کے دوران جب کہیں پڑاؤ ڈالتے تو اِدھر اُدھر پھیل جاتے، اور اپنی اپنی پسند کی مختلف جگہیں ٹھہرنے کے لئے منتخب کر لیتے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار یہ صورت حال دیکھی تو سرزنش کرتے ہوئے فرمایا :۔

اِنَّ تَفَرُّقَكُمْ فِي هٰذِهِ الشِّعَابِ	تمہارا اس طرح مختلف گھاٹیوں اور
وَالْاَوْدِيَةِ اِنَّمَا ذَالِكُمْ	میدانوں میں منتشر ہو رہنا صرف
مِنَ الشَّيْطَانِ (ابوداؤد ج ۱ ص ۳۵۴)	شیطان کی وجہ سے ہے۔

اس تنبیہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ "لوگ پھر کبھی اس طرح منتشر نہ ہوئے، اور جب کسی جگہ پڑاؤ ڈالتے تو ایک دوسرے سے بالکل لگ کر ٹھیرتے، حتیٰ کہ خیال ہوتا اگر انہیں ڈھکا جائے تو ایک ہی کپڑے کے نیچے سب آجائیں گے۔" (ایضاً)

معلوم ہوا کہ بغیر کسی جماعتی نظم کے پورا سفر کر ڈالنا تو درکنار، اس کے دوران چند گھنٹوں کا کوئی پڑاؤ بھی اگر اپنے اپنے طور پر کر لیا جائے اور اتنی سی دیر کی بھی زندگی شانِ اجتماعیت سے آراستہ دکھائی نہ دے سکے تو یہ بات بھی اسلام کو قطعی گوارا نہیں، اور اسے وہ شیطان کی پیروی قرار دیتا ہے۔

(۴) ایک صحابی کسی گھاٹی سے گزر رہے تھے۔ وہاں انھیں میٹھے پانی کا ایک چشمہ نظر آیا جس نے انھیں اپنا گرویدہ بنا لیا۔ دل نے کہا کاش میں آبادی کو چھوڑ کر یہیں آبستا، اس خواہش کو لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور پہنچے اور اجازت طلب کی، تو آپ نے فرمایا "نہیں، ایسا نہ کرو۔ کیونکہ اللہ کی راہ میں تمہارا کھڑا رہنا گھر کے اندر پڑھی جانے والی تمہاری ستر برس کی نمازوں سے بھی افضل ہے۔

لَا تَفْعَلْ فَاِنَّ مَقَامَ اَحَدِكُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَفْضَلُ مِنْ صَلٰوتِہٖ فِیْ بَیْتِہٖ سَبْعِیْنَ عَامًا۔ (ترمذی جلد اوّل)

یہ حدیث اس حقیقت کی عکاس ہے کہ اجتماعی زندگی کو چھوڑ کر تنہائی کی زندگی گزارنے میں چاہے جو بھی دینی اور دنیوی فائدے نظر آتے ہوں، لیکن اسلام اپنے پیروؤں کو اُدھر جانے اور اجتماع سے کٹ کر رہنے کی اجازت نہیں دیتا۔ کیونکہ یہ دینی اور دنیوی فوائد خواہ کتنے ہی عظیم کیوں نہ ہوں مگر ان فائدوں کے مقابلے میں بالکل ہیچ ہیں جو ایک منظم اسلامی معاشرے کے اندر ایک مسلمان کو حاصل ہو سکتے ہیں۔

غور کیجئے، سفر اور حضر سے متعلق یہ مختلف دینی ہدایتیں اسلامی نظام فکر و عمل میں اجتماعیت کی ضرورت و اہمیت کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہیں! یہ یقیناً ایک ایسی حقیقت کا انکشاف کرتی ہیں جس کو صرف اسلام ہی کے اندر موجود پایا جا سکتا ہے، اور جس سے دُنیا کا ہر دوسرا معاشرہ اور نظام نا آشنا ہے۔ یہ اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہیں کہ اسلامی زندگی کے اجتماعی تقاضے صرف احکامِ خلافت کی بجا آوری پر جا کر ختم نہیں ہو جاتے، بلکہ اس دائرے سے باہر کی عام زندگی کو بھی اپنی گرفت میں لئے ہوئے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اسلام کے نزدیک اجتماعیت کی اہمیت انتہائی بلند ہی نہیں، انتہائی وسیع اور ہمہ گیر بھی ہے، حتّٰی کہ انسان کے عام رہن سہن کا کوئی گوشہ بھی اس کی حدودِ اثر سے آزاد نہیں۔ علامہ شوکانیؒ ان حدیثوں کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"یہ حدیثیں اس بات کی دلیل ہیں کہ جہاں کہیں بھی تین یا تین سے زائد مسلمان ہوں ان کے لئے حکمِ شریعت یہ ہے کہ وہ اپنے میں سے ایک شخص کو اپنا امیر منتخب کر لیں۔ کیونکہ اسی طرح باہمی اختلافات سے محفوظ رہا جا سکتا

ہے ....اور اگر ان تین افراد کے لئے بھی جو کسی جنگل میں ہوں یا ایک ساتھ سفر کر رہے ہوں، حکم شریعت یہ ہے تو اس بڑی تعداد کے مسلمانوں کے لئے جو کسی گاؤں یا شہر میں ایک ساتھ رہتے ہوں، یہ بدرجۂ اولیٰ مشروع ہوگا۔"

(نیل الاوطار، جلد ۹ ص۱۵۷)

(۴) عبادتوں کے اجتماعی آداب کی زبان سے

انسانی زندگی کا وہ شعبہ، جسے عرف عام کے لحاظ سے "عبادتی شعبہ" کہنا چاہئیے، ایک ایسا شعبہ ہے جہاں اجتماعیت کی رسائی کا تصور بھی مشکل سے کیا جا سکتا ہے۔ عبادت الٰہی کا نام لیجئے، ذہن آپ سے آپ گوشوں اور تنہائیوں کی طرف دوڑ پڑتے ہیں۔ خیال ہونے لگتا ہے کہ عبادت خالصتہً دین کا اور آخرت کا کام ہے، کسی پہلو سے بھی دنیا کا کام نہیں۔ پھر اسے کسی طرح بھی سامانِ جلوت کیسے بنایا جا سکتا ہے، گھر کی، محلے کی، بستی کی، پورے ملک کی زندگیاں اجتماعی نظم کی محتاج ضرور کہی جا سکتی ہیں، مگر خدا کو یاد کرنے کے لئے بھی کسی اجتماعیت کی ضرورت محسوس کی جائے، یہ بات کچھ سمجھ میں آنے والی نہیں، یاد الٰہی اور عبادت کی تو فطرت ہی گرد و پیش سے بے تعلقی چاہتی ہے۔ غرض عبادت گاہیں اور ریاضت کدے وہ مقامات ہیں جہاں ماسوا کا تصور بھی گوارا نہیں کیا جا سکتا ـــــ اب اگر کوئی دین، عبادات کے اندر کچھ اجتماعی آداب کو لازم ٹھیراتا ہے تو کہنا چاہئیے کہ اس نے اجتماعیت کو اہمیت دینے میں سب سے آخری قدم اُٹھا دیا ہے۔ ایسی حالت میں اس امر کا اندازہ لگانے کے لئے کہ اس دین میں اجتماعیت کو کس درجہ کی اہمیت ملی ہوئی ہے، اُن آدابِ اجتماعی سے زیادہ فیصلہ کُن اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی جنھیں اس نے اپنی عبادتوں میں ملحوظ رکھنے کا حکم دے رکھا ہو، یہ آداب شمار میں جتنے ہی زیادہ ہوں گے، اور انھیں

جتنا ہی زیادہ ضروری ٹھیرایا گیا ہوگا، کوئی شک نہیں کہ اس دین میں اجتماعیت کا حاصل شدہ مقام اتنا ہی اونچا قرار پائے گا۔

جہاں تک اسلام کا تعلق ہے، بالیقین وہ ایک ایسا ہی دین ہے جس کی عبادتوں میں اجتماعی آداب سموئے ہوئے ہیں۔ کس حد تک اور کس اہمیت کے ساتھ سموئے ہوئے ہیں؟ اس امر کا تفصیلی جائزہ ذیل کی سطروں میں ملاحظہ کیجئے۔

(۱) **نماز:**۔ اس سلسلے میں ہمیں قدرتی طور پر سب سے پہلے نماز کو لینا چاہیئے۔ کیونکہ ساری عبادتوں میں وہ سب سے بڑی عبادت ہے، پورے دین کا مغز اور بندگی کا سرچشمہ ہے، اور اُسے اسلام کا شاہ ستون (عِمَادُ الدِّیْنِ) فرمایا گیا ہے۔ اس عبادت کو جن شرائط اور آداب کے ساتھ ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے اُن میں یہ اُمور بھی شامل ہیں۔

(ا) نماز ادا کرتے وقت ہر مسلمان کا رُخ ایک ہی خاص مقام (کعبہ) کی طرف ہونا چاہیئے (وَحَیْثُ مَا کُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْھَکُمْ شَطْرَهٗ، بقرہ) کسی کا مسلمان تسلیم کیا جانا موقوف ہے اس بات پر کہ وہ کعبہ ہی کی طرف مُنہ کر کے نماز پڑھے (مَنْ صَلّٰی صَلٰوتَنَا وَاسْتَقْبَلَ قِبْلَتَنَا وَاَکَلَ ذَبِیْحَتَنَا فَذٰلِکَ الْمُسْلِمُ الخ (بخاری جلد ۱ ص۵۶) ایک ہی خاص مقام کی طرف رُخ کرنے کا ایسا تاکیدی حکم اس حقیقت کے باوجود ہے کہ نماز جس اللہ کی یاد کا نام ہے وہ ہر جگہ اور ہر طرف ہے، کسی خاص جگہ یا کسی خاص سمت میں محدود نہیں ہے، جیسا کہ خود قرآن نے اس کا اعلان کیا ہے اور واضح ترین لفظوں میں کیا ہے۔ (فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ (بقرہ)

(ب) فرض نمازوں کو ــــ ان فرض نمازوں کو جو تمام نمازوں کے درمیان فی الواقع اصل نماز ہیں ــــ اکٹھے مل کر ادا کرنے کی تاکید فرمائی گئی ہے، اور نماز باجماعت کا ثواب اس نماز کے مقابلے میں ستائیس گُنا بتایا گیا ہے جو اکیلے پڑھ لی گئی ہو۔ (بخاری جلد ۱

نماز کی یہ باجماعت ادائیگی جس حد تک ضروری ہے اس کا اندازہ صرف اسی ایک بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ لوگوں کے بارے میں، جو کسی عذر کے بغیر نماز باجماعت سے غیر حاضر تھے، فرمایا "میرا ارادہ ہوتا ہے کہ کسی کو اپنی جگہ نماز پڑھانے کے لئے مقرر کر دوں، پھر ان لوگوں کے پاس جاؤں جو نماز باجماعت میں حاضر نہیں ہوتے، اور حکم دوں کہ لکڑیوں کے گٹھر ڈال کر اُن کے سمیت اُن کے گھروں کو پھونک دیا جائے۔" (مسلم جلد ۱)

یہ اس نبیؐ کے الفاظ ہیں جو رحم و شفقت کا پیکر تھا۔ اس کے باوجود تارکِ جماعت کے بارے میں آپؐ کی زبان سے ایسے سخت اور دہشت بھرے الفاظ کا نکلنا بتاتا ہے کہ باجماعت نماز نہ پڑھنا کوئی معمولی کوتاہی نہیں بلکہ ایک سنگین معصیت ہے۔

(ج) نماز کو اکٹھے مل کر اور باجماعت ادا کرنے کے سلسلے میں صرف اتنی ہی بات کافی نہیں ہے کہ لوگ اپنے گھروں سے نکل کر ایک جگہ جمع ہو جائیں اور پھر اپنے اپنے طور پر اللہ کی یاد میں مشغول رہیں، بلکہ ضروری ہے کہ سب لوگ صفیں باندھ کر اور کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہوں، اور صفیں تیر کی طرح سیدھی ہوں۔ (بخاری جلد ۱) پھر سب میں سے ایک اہل تر شخص پوری جماعت کا امام ہو، جو سب کے آگے کھڑا ہو، اور سب لوگ اس کی اقتداء میں یہ فریضہ ادا کریں، اقتدا ایسی کامل ہو کہ پوری جماعت کی ایک ایک حرکت امام کی حرکت کے تابع ہو، پوری جماعت امام کے ساتھ ہی کھڑی ہو، اسی کے ساتھ جھکے، اسی کے ساتھ سجدے میں جائے، اسی کے ساتھ قعدہ کرے، جس وقت وہ قرأت کر رہا ہو پوری خامشی اور یکسوئی کے ساتھ اس کی سماعت کرے۔ نماز کی ادائیگی میں اگر وہ کسی بھول چوک کا مرتکب ہو رہا ہو تو بھی اس کی اقتدار سے علیحدگی اختیار کر لینے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ بس "سُبحان اللہ" کہہ کر اُسے

اس غلطی پر متنبہ کر دیا جائے۔

یہ دونوں باتیں ____ صف بندی اور امام کی پیروی ____ محض فضائل نماز کا مرتبہ نہیں رکھتیں، بلکہ وہ نماز باجماعت کی شرطوں میں داخل ہیں۔ ان میں اگر نقص رہا تو یہ نقص نماز کو بھی ناقص بلکہ بے سود بنا کر رکھ دیتا ہے، اور اس سے صرف آخرت ہی نہیں، دنیا کی زندگی بھی تباہیوں کے خطرات میں گھر جاتی ہے۔ ایک شخص کا سینہ صف سے ذرا باہر نکلا ہوا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تنبیہ فرمائی:۔

عِبَادَ اللّٰهِ لَتُسَوُّنَّ صُفُوْفَكُمْ	اللہ کے بندو! اپنی صفوں کو ضرور
اَوْ لَيُخَالِفَنَّ اللّٰهُ بَيْنَ	ہی درست اور سیدھی رکھو ورنہ
وُجُوْهِكُمْ۔	اللہ تمہارے رُخ ایک دوسرے
(مسلم جلد ۱)	کے خلاف کر دے گا۔

ایک اور موقع پر آپؐ نے فرمایا "جو شخص نماز کی کسی صف کو جوڑے گا اسے اللہ جوڑے گا، اور جو کسی صف کو کاٹے گا اُسے اللہ کاٹ دے گا۔ (ابو داؤد جلد اوّل)

اسی طرح امام کی اقتدار کے سلسلے میں آپ کا ارشاد ہے کہ "جب تم سے کوئی شخص امام سے پہلے ہی (مثلاً رکوع سے) اپنا سر اُٹھا لیتا ہے تو کیا اسے اس وقت اس بات کا ڈر نہیں رہتا کہ اللہ تعالیٰ اس کے سر کو گدھے کا سر بنا دے گا۔ (مسلم جلد ۱)

(د) نماز کو جماعت کے ساتھ اور ایک امام کی اقتداء میں ادا کرنے کا یہ حکم عام، ظاہر ہے کہ محلہ واری، نوعیت کا ہے۔ یعنی اس حکم کا منشا یہ ہے کہ بستی کے ہر محلے کے لوگ اپنی پانچوں فرض نمازیں اپنے محلّے کی مسجد میں باجماعت ادا کریں۔ لیکن اس سلسلے میں شریعت اسی پر بس نہیں کرتی، بلکہ ابھی اور آگے جاتی ہے، اور ہدایت دیتی ہے کہ ہفتہ میں ایک نماز اس طرح پڑھی جائے کہ بستی کے تمام باشندے ایک ہی مسجد میں

اکٹھے ہو جائیں، اور پوری بستی ایک جگہ، ایک امام کے پیچھے، ایک ساتھ اپنے رب کے حضور جھکے۔ یہ جمعہ کی نماز ہے۔ اس نماز کی عظمت اور اہمیت سورۂ جمعہ کا نظم کلام یہ بتاتا ہے کہ امتِ مسلمہ اپنا فرضِ منصبی اسی وقت ٹھیک ٹھیک ادا کر سکتی ہے جب کہ اس کا طرز فکر و عمل اپنی حقیقی شان کے ساتھ باقی ہو، اور اس طرز فکر و عمل کا اپنا حقیقی شان کے ساتھ باقی رہنا جن باتوں پر موقوف ہے، انمیں سے ایک یہ نماز جمعہ کی اقامت بھی ہے۔ اگر مسلمانوں نے اس نماز کا حق نہ ادا کیا تو وہ بھی اسی قانونِ خداوندی کی زد میں آسکتے ہیں جسکی زد میں آکر پچھلی ملتیں (خصوصاً ملتِ یہود) ذلت کی موت مر چکی ہیں۔ کچھ ایسی ہی ہدایت اور تنبیہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمائی ہے۔ آپؐ کا صریح ارشاد ہے کہ "لوگوں کو جمعہ کی نماز چھوڑنے سے باز ہی آجانا چاہیئے، ورنہ ایسا ضرور ہو گا کہ اللہ تعالیٰ ان کے دلوں پر مُہر کر دے گا، اور پھر وہ حق سے غافل ہو کر رہ جائیں گے۔ (مسلم۔ جلد ۱)

(۵) نماز میں جو کچھ پڑھنے کی تلقین کی گئی ہے اس میں کثرت سے جمع کے صیغے استعمال کئے گئے ہیں۔ مثلاً "اِیَّاكَ نَعْبُدُ" (خدایا ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں)۔ "اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ" (ہم تجھی سے مدد مانگتے ہیں) "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ" (ہمیں سیدھی راہ چلا) رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ (اے ہمارے پروردگار! حمد تیرے ہی لئے ہے)۔ "اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا وَعَلٰی عِبَادِ اللّٰهِ الصّٰلِحِیْنَ" (سلامتی ہو ہم سب پر اور اللہ کے سارے نیکوکار بندوں پر) وغیرہ ــــــ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ نماز ادا کرتے وقت لوگوں کو جس طرح ظاہری طور پر اکٹھے اور صف بستہ ہو رہنے کی ہدایت ہے، اسی طرح ذہنی طور پر بھی باہمی وحدت اور یگانگی کا احساس رکھنے کا حکم ہے۔

یہ امور ایسے ہیں جن کے بغیر نماز، نماز ہوتی ہی نہیں۔ واضح طور پر یہ سب اجتماعی آداب ہیں، اور ان کا منشا اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ نماز کو شعورِ اجتماعیت اور احساسِ نظم و انضباط

کا بھی سرچشمہ بنا دیا جائے، مسلمان جس وقت پوری توجہ سے بلکہ اپنے پورے وجود سے اللہ تعالیٰ کی طرف کھنچا ہوا ہوتا ہے اس کے لئے اس وقت بھی ایک جماعت کا جزو ہونے کی واقعیت ناقابلِ فراموش ہو، وہ حضوری کے ان مخصوص ترین لمحات میں بھی اپنے کو ایسا مستقل اور بے ہمہ فرد نہ تصور کرے جو اپنے فرائض، اپنے مقصدِ حیات اور اپنے مفادات کے لحاظ سے دوسرے تمام اہلِ ایمان سے بالکل الگ تھلگ ہو، اور ان فرائض کی تکمیل اور ان مقاصد و مفادات کی تحصیل میں ان سے نہ کوئی ربط رکھتا ہو نہ اس ربط کی کوئی ضرورت محسوس کرتا ہو۔ اس کے بخلاف وہ اپنی دعاؤں اور گذارشوں تک سے بھی یہ حقیقت بار بار نمایاں کرتا رہے کہ اس کے سامنے اپنی انفرادیت کا استقلال بھی ہے اور جماعت کا ناقابل فراموش ارتباط بھی۔ وہ خشکی کا مسافر نہیں ہے کہ اکیلے ہی منزلِ مقصود تک پہنچ جائے گا، بلکہ کشتی کا مسافر ہے جو عام حالات میں سارے اہلِ کشتی کے ساتھ ہی ساحلِ مراد پر قدم رکھ سکتا ہے۔

اب نماز کے ان سارے اجتماعی آداب کو، اور ان کے پیچھے کام کرنے والے اس منشا کو سامنے رکھ کر اندازہ لگائیے کہ اس عبادت میں اجتماعیت کی روح کس زور و قوت کے ساتھ رچا بسا دی گئی ہے، اور اس سے اجتماعیت کا مقام کتنا عظیم دکھائی دینے لگتا ہے! لیکن یہ اندازہ صحیح اور مکمل نہ ہوگا جب تک کہ نماز کے بنیادی مقصد اور اس کی اصل غرض و غایت اور ان آداب کی مناسبت کا حال بھی نظر میں نہ ہو۔ نماز کی اصل غرض خدا کے دربار کی حاضری اور اس کا ذکر ہے، اور اس ذکر کی جان، دل کا عاجزانہ جھکاؤ ہے۔ یہ دونوں جانی بوجھی حقیقتیں ہیں۔ غور کیجئے کہ نماز کے اس اصل مقصود کو حاصل کرنے کے لئے کون سا مقام زیادہ سازگار ہو سکتا ہے؟ گوشۂ تنہائی یا مجمع عام؟ یادِ الٰہی کا استغراق، خلوت کا سکون چاہتا ہے یا جلوت کی ہماہمی؟ دل کو

خشوع کی دولت زیادہ آسانی کے ساتھ سنسان فضا میں میسّر آیا کرتی ہے یا محرومِ سکوت ماحول میں ؟ اس سوال کا جواب کوئی شک نہیں کہ صرف ایک ہی ہوگا۔ ہر شخص یہی کہے گا کہ اللہ کی یاد، دل کی کامل یکسوئی چاہتی ہے، اور دل کی کامل یکسوئی، تنہائی کا سکوت مانگتی ہے۔ اب ایک طرف تو نماز کا یہ اصل مقصد، اور اس مقصد کے حاصل ہو سکنے کی یہ مطلوبہ شکل دیکھئے، دوسری طرف شریعت کا یہ فرمان سُنیے کہ فرض نمازوں کے لئے اجتماع ضروری ہے اور تنہائی ناقابلِ معافی جُرم، پھر اجتماع بھی اجتماعِ محض نہیں بلکہ انتہائی معیاری اور پوری طرح کسا بندھا اجتماع۔ صفیں باندھنا ضروری، صفوں کو تیر کی طرح سیدھا رکھنا ضروری، لوگوں کو باہم مل کر اور جُڑ کر کھڑا ہونا ضروری، ایک شخص کا امام اور باقی تمام لوگوں کا اس کا مقتدی ہونا ضروری، امام کی پیروی میں اور اس کے اشاروں کے مطابق ہی سب کا ایک ساتھ کھڑا ہونا، ایک ساتھ جھکنا، ایک ساتھ بیٹھنا، ایک ساتھ سجدہ کرنا اور پھر ایک ہی ساتھ نماز ختم کرنا، سب ضروری !!!

بات بظاہر کتنی عجیب معلوم ہوتی ہے کہ نماز کی اقامت ایسے آداب و شرائط پر موقوف ہو جو دل کی یکسوئی اور باطن کے خشوع میں رہ رہ کر خلل ڈال سکتے ہیں۔ سوچنے کی بات ہے کہ آخر ایسا کیوں کیا گیا ؟ اور جو چیزیں نماز کے اصل مقصد تک میں خلل ڈال سکتی ہوں انھیں فعلِ نماز کے اندر گوارا ہی نہیں، بلکہ اُلٹا ضروری تک کیسے قرار دے دیا گیا ہے ؟ اس غور و فکر کے بعد آپ جس نتیجہ پر بھی پہنچیں، اس کے اندر یہ حقیقت بھی لازمًا داخل ہی ہوگی کہ شارعِ اسلام کو مسلمانوں کے اندر منظم اجتماعیت کا شعور بیدار اور مستحکم رکھنا انتہائی اور غیر معمولی حد تک عزیز تھا، اتنا عزیز کہ نماز کے اصل مقصد تک کے حصول میں دشواریاں پیدا ہو جانے کے کھُلے ہوئے عملی امکان پر اس نے اس

شعور کی بیداری اور استحکام کو ترجیح دی[1]۔ بلاشبہ یہ اس امر کی بھی دلیل ہے کہ ملت میں منظم اجتماعیت کے شعور کو بیدار رکھنا بجائے خود اقامت نماز کا ایک ذیلی مقصد ہے[2]۔

۱؎ چنانچہ اس امر پر علماء کا اتفاق ہے کہ اگر کسی شخص کو تنہائی میں نماز پڑھنے سے تو پورا پورا خشوع حاصل ہوتا ہے لیکن جماعت کے ساتھ پڑھنے میں اس کے خیالات اکثر بٹ جایا کرتے ہوں تو بھی اس کے لئے یہ صحیح نہیں ہے کہ فرض نمازیں تنہائی میں ادا کرے اور جماعت کی شرکت چھوڑ دے۔ صرف ایک صاحب، امام غزالیؒ کی رائے اس کے خلاف ہے۔ یعنی انھوں نے جماعت کی شرکت پر خشوع کے حصول کو ترجیح دی ہے مگر ان کی اس رائے کو کوئی اہمیت نہیں دی گئی ہے ـــ (واما افتاء الغزالی فی من یتحقق من نفسہ انہ یخشع فی جمیع صلوٰتہٖ منفرداً دون ما اذا صلّٰی فی جماعۃ لتشتّت ھمّہ بانہ اذا کان الجمع یمنعہ الخشوع فی اکثر صلوٰتہٖ فالانفراد لہٗ اولیٰ فردّوہ) (حاشیہ مشکوٰۃ ص۹۶)

۲؎ اس موقع پر یہ بات بھی یاد دلا دینے کی ہے کہ فرض نمازوں کی باجماعت ادائیگی سے نماز کے اصل مقصد (ذکر الٰہی) کے حصول میں اگر خلل اور دشواری پیدا ہونے کے امکانات ہیں تو شریعت نے اس معاملہ کو یونہی نہیں چھوڑ دیا ہے، بلکہ تلافی کی صورت بھی تجویز کر دی ہے اور وہ اس طرح کہ جہاں اس نے فرض نمازوں کو ایسے زبردست اجتماعی آداب کے ساتھ ادا کرنے کا حکم دیا ہے، وہیں اس امر کی بھی ترغیب دے رکھی ہے کہ دوسری تمام نمازوں کو مسجد کے بجائے اپنے گھروں ہی میں پڑھا جائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ صَلُّوْا اَیُّھَا النَّاسُ فِیْ بُیُوْتِکُمْ فَاِنَّ اَفْضَلَ الصَّلٰوۃِ صَلٰوۃُ الْمَرْءِ فِیْ بَیْتِہٖ اِلَّا الْمَکْتُوْبَۃَ۔ (بخاری جلد اوّل) (لوگو! نمازیں اپنے گھروں میں پڑھا کرو، کیونکہ سب سے اچھی نماز وہ ہوتی ہے جسے آدمی اپنے گھر میں پڑھتا ہے، سوائے فرض نمازوں کے) (بقیہ حاشیہ ص۴۱ پر)

۲۔ زکوٰۃ :۔ نماز کے بعد دوسری اہم ترین عبادت "زکوٰۃ" ہے۔ زکوٰۃ کا ادا کرنا اسلامیت کی ان دو بنیادی باتوں میں سے ایک ہے جو کسی غیر مسلم کے دائرۂ اسلام میں داخل قرار پانے یا نہ پانے کا، سیاسی طور پر فیصلہ کرتی ہیں۔ اس عبادت کے

چنانچہ خود آپؐ کا اپنا اُسوہ بھی یہی تھا۔ آپؐ نفل اور سنّت نمازیں اپنے حجرے ہی میں پڑھا کرتے تھے۔ آپؐ کے اس ارشاد اور عمل کی سب سے اہم مصلحت واضح طور پر یہی ہے کہ گھر کی تنہائی میں دل کو پوری یکسوئی میسّر ہوتی ہے، اس لئے نماز کا اصل مدعا حاصل کرنے کے لئے یہ جگہ زیادہ موزوں اور سازگار ہے۔ اس طرح یہ نفل نمازیں خشوعِ باطن کے حصول کی اس امکانی کسر کا پورا پورا بدل مہیا کردیتی ہیں جو فرض نمازوں میں جماعت کی پابندیوں کے باعث رونما ہوسکتی ہے۔

اب اگر نماز کی فیض بخشیوں پر بحیثیت مجموعی نظر ڈالیے تو صاف دکھائی دے گا کہ وہ کامل خیرِ باطن اور کامل خیرِ ظاہر، دونوں کی جامع ہے، اگر وہ باطن کو حق کی حضوری عطا کرتی ہے تو ساتھ ہی ظاہر کو اجتماعیت کے آداب سے مزیّن، اور نظم و اتحاد کی قوتوں سے مالامال بھی کرتی رہتی ہے اس کے اس فیضان سے خواہ آج کے پیروانِ اسلام کتنے ہی بے خبر کیوں نہ ہوچکے ہوں، مگر ایک زمانہ ایسا بھی گزرا ہے جب اسلام کے دشمن بھی اس سے بے خبر نہ تھے۔ مورخین کا بیان ہے کہ :۔

كَانَ رستم اذا رأى	(مشہور ایرانی سپہ سالار) رستم
المسلمين يجتمعونَ	جب میدانِ جنگ میں مسلمانوں کو
الصلوٰة يقول اكل عمر	نماز کے لئے اکٹھے ہوتے دیکھتا تو
كبدى يعلم الكلاب	کہہ اُٹھتا، عمرؓ میرا کلیجہ کھائے
الآداب۔	جارہا ہے، وہ کتّوں کو آداب
(مقدمہ ابن خلدون صـ۱۳۲)	سکھارہا ہے۔

سلسلے میں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:۔

إِنَّ اللّٰهَ افْتَرَضَ عَلَيْهِمْ	اللہ نے مسلمانوں پر زکوٰۃ فرض کی
صَدَقَةً تُؤْخَذُ مِنْ	ہے، جو ان کے مال داروں سے لی
أَغْنِيَائِهِمْ وَتُرَدُّ عَلٰى	جاتی ہے اور ان کے ضرورت مندوں
فُقَرَائِهِمْ۔ (مسلم جلد ۱)	پر لوٹا (کر بانٹ) دی جاتی ہے۔

اس ارشادِ نبوی سے دو خاص باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک تو یہ کہ اس اہم عبادت کی جو غرض وغایت ہے اس کا ایک رُخ (خارجی رُخ) اسلامی معاشرے کے اقتصادی مصالح کی طرف ہے یعنی یہ جس مقصد سے فرض کی گئی ہے اس کے اندر یہ بات بھی شامل ہے کہ ملّت کے حاجت مند افراد اپنی معاشی مجبوریوں اور پریشانیوں سے نبٹنے کے لئے بے سہارا نہ رہ جائیں۔ دوسری یہ کہ طریقہ اس عبادت کا یہ ہے کہ مالِ زکوٰۃ مالدار مسلمانوں سے لیا اور وصول کیا جائے، اور پھر تنگ حال مسلمانوں میں تقسیم کر دیا جائے، یہ نہیں ہے کہ مال دار مسلمان خود ہی زکوٰۃ نکال کر غریبوں کو دے دیا کریں۔" وصول کئے جانے اور تقسیم کر دئے جانے" (تُؤْخَذُ وَتُرَدُّ) کی بات چاہتی ہے کہ لازماً کوئی ہاتھ ہو جو وصول کرنے اور تقسیم کرنے کا فریضہ انجام دے۔ واضح طور پر یہ ہاتھ حکومت ہی کا ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ قرآنِ مجید کے الفاظ " وَالعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا " سے معلوم ہوتا اور دورِ نبوی ودورِ خلافتِ راشدہ کے تعامل سے ثابت ہوتا ہے۔ ایک مسلمان کو اپنا مالِ زکوٰۃ حکومت کے حوالے کرنا جس درجہ ضروری ہے اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ عہدِ صدیقی میں جب کچھ لوگوں نے ایسا کرنے سے انکار کیا تو خلیفۂ رسولؐ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ نے ان کے خلاف تلوار کھینچ لی، اور پوری عزیمت کے

ساتھ فرمایا:-

وَ اللّٰہِ لَوْ مَنَعُوْنِی عِقَالاً كَانُوْا يُؤَدُّوْنَهٗ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰہُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَقَاتَلْتُهُمْ عَلٰى مَنْعِهٖ۔ (مسلم جلد ۱۔ کتاب الایمان)	خدا کی قسم، اگر ان لوگوں نے اونٹ باندھنے کی ایک رسی کو بھی، جسے وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے کیا کرتے تھے، میرے حوالے کرنے سے روک رکھا تو میں اس کے لئے ان سے جنگ کروں گا۔

زکوٰۃ کے متعلق شریعت کے ان دونوں فرمانوں پر نظر ڈالئے، صاف محسوس ہوگا کہ اس نے اس عبادت کو بھی اجتماعیت کا سرچشمہ بنایا ہے۔ ایک طرف تو اس کے مقاصد ہی میں دوسروں کے ساتھ ہمدردی اور مواسات شامل ہے اور یہ وہ عمل اور جذبۂ عمل ہے جو صالح اجتماعیت کا سب سے اہم بنیادی پتھر ہے ——— دوسری طرف اس عبادت کے طریق ادا کو اس نے حکومتی نظام کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے ——— جو اجتماعیت کی کامل ترین شکل ہے۔ پھر اس نے ایسا اس حقیقت کے باوجود کیا ہے کہ زکوٰۃ کے اصل مقصد اور اس کی بنیادی غرض وغایت کے لئے یہ بات کچھ ناسازگار ہی ہوسکتی ہے، سازگار کسی طرح نہیں ہوسکتی۔ زکوٰۃ کا اصل مقصد اور اس کی بنیادی غرض وغایت نفس کا تزکیہ ہے (تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا) تاکہ اللہ کی رضا حاصل ہو (..... اِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى) ظاہر ہے کہ اس مقصد کا تقاضا یہی ہے کہ زکوٰۃ حاجتمندوں کو بطور خود دی جائے، اور اس طرح دی جائے کہ دینے والے کا بایاں ہاتھ بھی یہ نہ جانے

کہ دائیں ہاتھ نے کیا اور کسے دیا ہے؟ ورنہ کھلے طور پر، اور وہ بھی حکومت کے اقتدار، نظم اور ضوابط کے تحت زکوٰۃ دینے کی شکل میں خلوص اور للّٰہیت کے متاثر ہو رہنے کا اندیشہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اسلام نے نماز ہی کی طرح زکوٰۃ کی زبان سے بھی اپنی اجتماعیت پسندی کی شدت کا مظاہرہ کیا ہے۔ کیونکہ عبادت کے اصل اور بنیادی مقصد کے متاثر ہو رہنے کے امکان اور اندیشے پر اجتماعی آداب اور مصالح کو اس نے یہاں بھی ترجیح دے رکھی ہے۔

(۳) روزہ :۔ تیسری عبادت روزہ ہے۔ یہ ایک "منفی" قسم کی عبادت ہے یعنی اس میں نماز یا زکوٰۃ یا حج کی طرح کچھ کیا نہیں جاتا کہ اسے دیکھا جا سکتا ہو، بلکہ کچھ خاص کاموں سے رُکا جاتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جس عمل کی نوعیت منفی قسم کی ہو، اس کو اجتماعیت کا جامہ پہنانا دشوار، اور شعورِ اجتماعیت کی بقا و ترقی کا ذریعہ بنانا دشوار تر ہے۔ لیکن روزے کے سلسلے میں شریعت نے جو احکام دیئے ہیں ان سے صاف عیاں ہوتا ہے کہ اُس نے اِس منفی عبادت کو بھی اجتماعیت کا "ہادی" اور "معلم" بنا دیا ہے۔ حکم ہے کہ تمام مسلمان ایک ہی متعین مہینے میں روزے رکھیں۔ ہر روز تقریباً ایک ہی وقت سحری کھائیں اور پھر ایک ہی متعین وقت پر افطار کریں۔ ان احکام کے نتیجے میں اس عبادت سے جو صورتِ حال وجود میں آتی ہے وہ یہ ہوتی ہے کہ پورا اسلامی معاشرہ مسلسل ایک مہینے تک ایک منضبط تربیتی کیمپ کی شکل اختیار کر لیتا ہے، ایک ہی فضائے عبودیت ہوتی ہے جو مشرق سے مغرب تک چھائی ہوئی ہوتی ہے، ایک ہی حالت ضبط و ریاض ہوتی ہے جو فرد فرد کے چہرے سے نمایاں ہوتی ہے۔ کیا وہ معاشرہ، جس پر مسلسل ایک ماہ تک ایسی غیر معمولی یکساں ذہنی فضا اور یکساں ظاہری حالت طاری رہے اور جو پورے کا پورا ایک تربیتی کیمپ بنا ہوا ہو، اس کے افراد کے ذہنوں میں

یہ تصور رہ کر نہ اُبھرتا رہے گا کہ ہم سب ایک ہی مشن کے علم بردار اور ایک ہی محاذ کے سپاہی ہیں؟

بلاشبہ ایک منفی نوعیت کی عبادت کو بھی اس طرح اجتماعیت کا حامل بنا دینا حُبِّ اجتماعیت کے کمال کی دلیل ہے۔

(۴) **حج**:۔ اب چوتھی عبادت 'حج' کو لیجئے۔ حج کی غایت یہ ہے کہ اللہِ واحد کا پرستار اور معبودِ برحق کا جاں نثار بندہ اس گھر پر حاضری دے جو توحید کا مرکز ہے، جہاں ہر طرف سچی خدا پرستی کے شعائر فداکاری کا درس دے رہے ہیں، جو موحّدِ اعظم حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے ایمان و اسلام کی ایک مجسّم یادگار ہے ——— حاضری اس لئے دے تاکہ اس کے سر کی آنکھیں اور اس کے دل کی نگاہیں، دونوں ہی اس شہادتِ گہہ الفت کا قریب سے مشاہدہ کرلیں، اور وہ جان لے کہ قولِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰہ کی عملی تفسیر کیا ہے؟ پھر خدا پرستی کے سچے جذبات سے سرشار ہو کر بندگی کے میدانِ عمل میں ایک نئے جوش کے ساتھ واپس آئے۔

اس عبادت کے ارکان میں سب سے بڑا رکن میدانِ عرفات کی حاضری ہے۔ یہاں دنیا کے گوشے گوشے سے آئے ہوئے مختلف نسلوں، قوموں، زبانوں اور رنگوں کے لاکھوں مسلمان اکٹھے ہوتے ہیں۔ ان سب کا ایک امیرِ حج ہوتا ہے، یہ امیر پورے مجمع کو خطاب کرتا ہے، اور اسے ایمان کے حقائق، اسلام کے مطالبات اور بندگی کے آداب کی تلقین کرتا ہے۔ جو شخص اس اجتماع میں حاضر نہ ہو سکا اس کا حج ادا نہ ہو سکے گا، چاہے اس نے باقی مراسمِ حج کتنے ہی اہتمام سے کیوں نہ ادا کر لئے ہوں۔

اس سے معلوم ہوا کہ حج کو بھی نمایاں حد تک اجتماعیت کے قالب میں ڈھال دیا گیا اور شعورِ اجتماعیت کا ایک زبردست ذریعہ بنا دیا گیا ہے۔

اگر غور کیجئے تو دوسری عبادتوں کی طرح یہاں بھی دکھائی دے گا کہ حج کی جو اصل غایت ہے اس کا حصول کسی اجتماع کی ضرورت سے یکسر بے نیاز ہے، یہی نہیں بلکہ بعض پہلوؤں سے وہ اس کے لئے نامساعد بھی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ تنہائی کا سکون اور یکسوئی کسی ہنگامۂ اجتماع کے مقابلے میں اس امر کا بہتر موقع فراہم کر سکتی ہے کہ انسان کعبہ اور اطراف کعبہ کے شعائر اللہ سے ایمان کی تازگی حاصل کرے۔ لیکن اس حقیقت کے باوجود شریعت کہتی ہے کہ حج اجتماع کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ گویا دوسرے لفظوں میں وہ یہ کہتی ہے کہ اجتماعیت کی دینی اہمیت بتانے اور ذہن نشین کرانے میں دوسری عبادتوں سے وہ کسی طرح پیچھے نہیں ہے، بلکہ بعض اعتبارات سے ان سب سے آگے ہی ہے۔

اسلام نے اپنی عبادتوں میں جن اجتماعی آداب کو ملحوظ رکھنے کی ہدایت کی ہے ان کی ضروری تفصیل آپ کے سامنے آچکی، اور ان کے اندر ان آداب کی جو اہمیت ہے وہ بھی آپ ملاحظہ فرما چکے۔ اس کے بعد آپ کا اعتراف اس کے سوا اور کیا ہوگا کہ ان عبادتوں میں اجتماعیت کی روح جس حد تک اتار دی گئی ہے اُس کے آگے کسی اور حد کا وجود عملی امکان سے باہر ہے۔

یہ ہے اجتماعیت کے نقطۂ نگاہ سے اسلامی تعلیمات کے مختلف شعبوں کا جائزہ۔ اس جائزے کے بعد یہ کہنا کسی طرح غلط نہ ہوگا کہ اسلام میں اجتماعیت کو جو بلند ترین مقام عطا کیا گیا ہے اس کی نظیر کسی اور مذہب میں تو کیا، کسی اور نظام میں بھی نہیں پائی جا سکتی۔